جلد ۹۴ نومبر ۱۹۸۰ء عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ضروری اطلاع

"تفہیم القرآن" اپنی بے پناہ مقبولیت کی بنا پر اکثر کمیاب رہی ہے۔
اس لیے بیک وقت مکمل چھ جلدیں مارکیٹ میں دستیاب نہیں ہو سکیں۔
قارئین کے اشتیاق کے پیش نظر ادارہ نے تفہیم القرآن کے سپیشل
سیٹ اپنے روایتی معیار کے مطابق خوشنما اور خوبصورت جلدوں میں تیار
کروانے کا بندوبست کیا ہے۔ سیٹ تیاری کے آخری مراحل میں ہیں۔

جو اصحاب مبلغ -/۳۳۰ روپے بذریعہ منی آرڈر، چیک یا
ڈرافٹ ادارے کے نام بھیج کر اپنا آرڈر بک کرالیں گے انہیں اسی رقم میں
سیٹ معہ پلاسٹک کور بذریعہ ڈاک آرڈر کی ترتیب کے مطابق روانہ کیے جائینگے

نوٹ: دفتر سے دستی حاصل کرنے والوں سے -/۳۱۵ روپے پیشگی
وصول کئے جائیں گے۔

ناظم

ادارہ **ترجمان القرآن** اچھرہ - لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۹۴ | نومبر ۱۹۸۰ء مطابق محرم ۱۴۰۱ھ | عدد ۳

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

فون نمبر — ۴۱۱۰۱۶ — ۴۱۰۳۱۶

زر سالانہ بیس روپے - فی پرچہ ۲/- روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

پرنٹر: سید حسین فاروق مودودی

غَفَرَ اللّٰہُ لَہٗ!

مولینا مفتی محمود بھی عالمِ آخرت کو روانہ ہو گئے۔

مفتی صاحب بہ حیثیت عالمِ دین، مدرس اور مفتی بڑا رتبہ رکھتے تھے اور خاص ان حیثیتوں سے بھی ان کے لئے محبت و احترام رکھنے والوں کا دائرہ بڑا وسیع تھا۔

علمائے دین میں سے مفتی صاحب کو سیاسی بصیرت بھی حاصل تھی۔ بہ حیثیت وزیر اعلیٰ سرحد انہوں نے جس کردار کا مظاہرہ کیا اور پھر اصولی وجوہ کے تحت استعفیٰ دے کر جو قبولیت عام حاصل کی، اس سے سارا ملک آگاہ ہے۔

پھر انہوں نے قومی اتحاد کے قیام میں جس طرح حصہ لیا اور جو خدمات اس متحدہ سیاسی قوت کے صدر کی حیثیت سے انجام دیں وہ ہماری سیاسی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہیں۔ قومی اتحاد کو جن دو حکومتوں سے سابقہ پڑا۔ ان کے ساتھ مفتی صاحب نے بڑا اصولی اور خود دارانہ معاملہ رکھا۔ وہ کبھی کسی جال میں نہیں آئے اور نہ انہوں نے اپنے ضمیر کے خلاف کسی کے لئے کبھی خم کھایا۔ سخت بحرانی حالات میں جس ہمارت سے انہوں نے قومی اتحاد کی سربراہی کی وہ ان کی بہت بڑی دینی اور ملکی خدمت ہے۔ بڑے نازک اور پیچیدہ مواقع پر ان سے اخباری نمائندوں نے سوالات کئے اور ان سے انٹرویو لئے جاتے رہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، کبھی کوئی کچی یا مغالطہ انگیز بات ان کے ہونٹوں سے نہیں نکلی۔ پروپیگنڈے کے ماہر حریفوں کو ان کی طرف سے کبھی حسب منشا ذہنی غذا نہیں مل سکی۔

دین سے اپنی گہری وفاداری کی وجہ سے سیاست میں آکر بھی وہ کھرا سونا ثابت ہوئے۔

ہم ان کی وفات کو ملک و قوم کے لئے باعثِ نقصان سمجھتے ہیں۔ مگر سوائے صبر کے کوئی چارہ نہیں پاتے۔ اللہ تعالیٰ ان پر خاص رحمت فرمائے۔ ان کی قبر کو وسیع اور پُر نور بنائے۔ ان کے تمام افرادِ خانہ کو صبر سے نوازے اور اس بھاری صدمے کے بعد ان پر خصوصی رحمتیں فرمائے۔

ہم ان تمام علمائے دین سے بھی دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ جن کو مفتی صاحب سے محبت تھی۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اسلام علم کے بغیر نہیں!

اوّلاً خدا اور اس کی توحید، نبوت و وحی، اُخروی جزا و سزا، اور تقدیر خیر و شر کا علم اور اس پر ایمان، پھر خدا کی نازل کردہ الہامی ہدایت کا علم اور اس کے ساتھ اسوۂ نبوتؐ یا کتاب اللہ کی اس قولی و عملی تشریح کا علم جسے سنّتِ رسول اللہ کہتے ہیں، آخر میں تفسیر و حدیث سے متعلقہ علوم اور تفقہ اور اجتہاد کے اصول و طُرق کا علم۔ ان سارے بنیادی علوم سے جن دوسرے ضروری علوم کا گہرا تعلق ہے، اُن پر عبور، خواہ وہ لغت اور نحو ہو، تاریخ و سیر ہو، اسماء الرجال ہو یا ادب و بلاغت۔

مسلمان کسی بھی علاقے کا آدمی ہو اور کوئی بھی بولی بولتا ہو، اس کا صحیح مقام یہ ہے کہ وہ علمِ دین کو اُن مآخذ سے براہِ راست حاصل کرے۔ یہ اگر ممکن نہ ہو تو کم تر درجہ یہ ہے کہ کسی بھی زبان میں قرآن، حدیث، فقہ اور اُن سے متعلقہ علوم میں جتنی دست گاہ حاصل کر سکتا ہو کرے۔ اس کم تر درجے کا علم بھی اتنا ضرور ہونا چاہیے کہ دینی علوم کی اصطلاحات اور معروف دزبان زد کلیات کو ضرور جانتا ہو تاکہ اگر مآخذ کا براہِ راست علم رکھنے والے ماہرین بات کریں تو وہ اُسے سمجھ سکے۔

عام مسلمان کی ذمہ داری بھی کم نہیں کی جا سکتی، مگر ایسے لوگ جو دوسروں میں دین کی دعوت پھیلانے اور اقامتِ دین کی تحریک چلانے نکلے ہوں، وہ تو ضروری علم یا صلاحیتِ فہم کے بغیر ایک قدم بھی اس راہ میں نہیں چل سکتے۔

اِسلام کی راہ میں جب بھی بڑا کام کرنا ہو تو جہاں یہ لازم ہے کہ اس کام میں حصّہ لینے والا ہر شخص علمِ دین حاصل کرنے کی جدوجہد کرے اور مسلسل کرتا رہے، وہاں یہ حقیقت بھی سامنے رکھنی چاہیے کہ ایسے وسیع کام میں آنے والے حضرات ہماری سوسائٹی کے اُن دونوں علمی دائروں سے آئیں گے جو تفریقِ دین و سیاست نے پیدا کر دیے ہیں۔ کچھ دینی علوم کے لحاظ سے پیش پیش ہوں گے اور کچھ جدید علوم سے آراستہ ہوں گے اور کچھ بین بین۔ یہ سب اگر مل کر ایک قوت بن سکتے ہیں اور ہم آہنگی سے کام کر سکتے ہیں تو صرف اُس صورت میں جب کہ دونوں ایک دوسرے کے اندازِ گفتگو اور اختیار کردہ اصطلاحات کا فہم پیدا کریں۔ دونوں فریق اپنے اپنے نظام ہائے تعلیم کی قائم کردہ سرحدوں سے آگے نکل کر دوسری جانب سے بھی استفادہ کریں۔

لیکن چونکہ علمِ دین اسلام کے تمام خادموں کی ایسی اشد اور بنیادی ضرورت ہے کہ اس کے بغیر ایمان کے عملی تقاضے پورے ہی نہیں کیے جا سکتے، اس وجہ سے تمام علوم کے مقابلے میں علمِ دین کو اوّلیت حاصل ہے۔ اور قرآن و حدیث میں جس "العلم" کے حصول کو فریضہ قرار دے دیا گیا ہے وہ علمِ دین ہی ہے۔ جدید حضرات علمِ دین حاصل کر کے ہی اپنے پڑھے ہوئے علوم کو نئی شکل دے سکتے ہیں اور اُن میں نئی رُوح پیدا کر سکتے ہیں۔ اِس قسم کی تبدیلی کے بغیر تو الحاد اور مادیت اور سامراجی بنیادوں پر قائم شدہ علوم حیرت انگیز معلومات کے باوجود اپنی روح کے اعتبار سے عہدِ جدید کی شاندار جاہلیت ہی رہیں گے۔

اگر کسی حلقے یا نظام میں علمِ دین کو اوّلیت حاصل ہے تو قدرتی طور پر علمائے دین کو بھی اوّلیت و اہمیت حاصل ہوگی۔ کیونکہ انہی سے جدید گروہوں کو بہت کچھ سیکھنا ہے اور اُس جوہر کو حاصل کرنا ہے جس کے اثر سے ملحدانہ افکار و علوم فروغِ اسلام کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

قاعدہ یہ ہے کہ اگر اساتذہ کا احترام نہ کیا جائے تو تعلیم کے دروازے آدمی پر پوری طرح نہیں کھلتے، اسی طرح اگر علمائے دین کے حقِ احترام کو ضائع کیا جائے تو آدمی علمِ دین حاصل نہیں کر سکتا۔

پس کسی صورت میں یہ روا نہیں کہ علما ئے دین کا کسی بہانے مذاق اُڑایا جائے یا اُن کو طنز کا نشانہ بنایا جائے جس ماحول میں انہوں نے برسوں تعلیم حاصل کی ہوتی ہے یا جس ماحول میں وہ قرآن، حدیث اور فقہ کے درس دیتے ہیں۔ اُس کے زیر اثر ایک خاص زبان مسلسل استعمال کرنے کی وجہ سے اپنی عام تقریروں یا گفتگوؤں میں بھی اسی خاص زبان کی جھلک کا آجانا فطری ہے۔ مگر یہ زبان متوسط دینی سوجھ بوجھ رکھنے والوں کے لیے اتنی بھی ناقابلِ فہم نہیں ہوتی کہ جیسے اسکیمو لینڈ میں پہنچ کر آپ کے پلّے کچھ نہیں پڑتا۔

اسلامی تحریک کی طرف بڑھنے والے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے یہ کچھ مشکل نہیں کہ علمِ تفسیر، علمِ حدیث اور اصولِ فقہ و استنباط کے متعلق ایک ایک مختصر رسالہ ایسا پڑھ لیں جن میں ضروری اصطلاحات اور تقریروں میں استعمال ہونے والے کلیوں کا تعارف کروا دیا گیا ہو۔

اِتنے چھوٹے سے کام کے لیے، عربی زبان سیکھنے کا انتظار کرنا بھی ضروری نہیں۔ اُردو زبان ہی میں ان ضروریات کو پورا کرنے کا سامان موجود ہے۔ "علم دین" تو وسیع چیز ہے، دین کا جنرل نالج تو ایسے افراد کو ضرور حاصل کرنا چاہیے جنہیں کوئی بڑا کام کرنا ہو، خواہ وہ کام صرف تحریر و تقریر ہی کا ہو۔

کوئی بھی شخص جس نے چند مناسب کتابیں قرآن و حدیث اور فقہ کے متعلق پڑھ لی ہوں، وہ کبھی اہلِ علم کی گفتگو سن کر اس چکر میں نہیں پڑے گا کہ اس کے پلّے کچھ نہیں پڑا۔ پلّے تو تب پڑے کہ پہلے "پلّا" ہو۔ مثلاً تفسیر ابن کثیر کا اُردو ترجمہ موجود ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کا مختصر رسالہ تفسیر پڑھا جا سکتا ہے۔ تفسیر اور مفسرین کی تاریخ جناب غلام احمد حریری نے لکھی ہے، حدیث کے متعلق مولانا مودودی مغفور کی تفہیمات اور منصبِ رسالت کے علاوہ، فتنۂ انکارِ حدیث کا منظر اور پس منظر، مختلف محدثین کے حالات اور کارناموں پر لٹریچر مل سکتا ہے۔ فقہ میں فقہائے اربعہ، عربی میں مختصر کتاب بدایۃ المجتہدین کے علاوہ امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ بن حنبلؒ، امام ابو حنیفہؒ اور امام ابن تیمیہؒ پر الگ الگ کتابیں موجود ہیں، جن میں اُن کے کام پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔ اور اصطلاحات بھی آجاتی ہیں۔ تاریخ فقہ اور تاریخ فقہا بھی موجود ہے۔ اصولِ فقہ پر غالباً بہت مختصر رسالہ بھی مل سکتا ہے (نام یاد نہیں)، اجتہاد کے موضوع پر چھوٹی چھوٹی متعدد کتابیں موجود ہیں۔ متعدد کتب احادیث کے مقدمے بڑے اہم ہیں۔

میں نہیں سمجھتا کہ ایک اُردو دان بھی اگر اس طرح کی دس پانچ کتابیں دیکھ لے تو وہ علمائے دین کی مروجہ زبان کو سمجھنے میں دقت محسوس کر سکتا ہے۔
چلیے ہوں آپ احکامِ دین کو دُنیا کے جدید حالات پر منطبق کرنے، اور علم اُس زبان اور طرزِ کلام کا بھی نہ ہو جو فقہ و استنباط کے معاملات میں رائج ہے۔
انقلاب ویسے ہی تو نہیں آجائے گا۔

کسی مجلس میں اگر کسی عالمِ دین کی ہونے والی گفتگو کا کوئی جزو سمجھ میں نہ آئے تو وقتی طور پر ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ نہایت سنجیدگی سے درخواست کی جائے کہ فلاں اصطلاح یا جملہ سمجھا نہیں جا سکا، اس کی وضاحت فرما دیں۔
بلکہ اس سے زیادہ آگے جانا چاہیے۔ کسی مجلس سے فارغ ہونے کے بعد کسی بزرگ سے گفتگو کی جا سکتی ہے کہ میں فلاں معاملے میں یہ یہ باتیں نہیں سمجھتا ہوں، مجھے اس بارے میں رہنمائی دیجیے۔ بات چیت کے بعد یہ بھی پوچھ لیجیے کہ کونسی آسان اور مختصر کتاب پڑھوں جس سے اس طرح کے مسائل کا فہم حاصل ہو جائے۔

ہم نے تو اپنا دورِ عمر اسی طرح گذارا ہے اور کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ دینی علوم کے ماہرین اور جدید علوم کے جاننے والوں کے درمیان اتنی بڑی خلیج اظہار (EXPRESSION GAP) حائل ہے کہ دونوں فریق اس کے دوسروں پر کھڑے ایک دوسرے سے کہہ رہے ہوں کہ "زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم"۔
آخر جدید علوم والے جو زبان بولتے ہیں ___ مثلاً ایک ماہر معاشیات یا ایک ڈاکٹر آف فلاسفی یا پولٹیکل سائنس اور سوشیالوجی اور سوِکس کے لیکچرر اگر بات کرتے ہیں تو اپنی عادت کی زبان سے نکل کر کوئی نئی زبان مشکل ہی سے اختیار کرتے ہیں۔ وہ بہت سی جدید اصطلاحات کو اس مفروضے سے

بولیں گے جیسے ہر کوئی پہلے سے سمجھتا ہے، انگریزی کے وزنی الفاظ بے تکلف استعمال کریں گے۔ حالانکہ اُن کے سامنے دیہاتی اور کم تعلیم یافتہ لوگ بھی موجود ہوتے ہیں۔ وہ بچارے نہ بھی سمجھیں تو ادب و شائستگی کو برقرار رکھتے ہیں اور کسی کا مذاق نہیں اُڑاتے۔

پھر الگ الگ صوبوں کے لوگ، اپنی علاقائی زبان بولنے کے اتنے عادی ہوتے ہیں کہ بعض تو کم سے کم موقعوں پر بولتے ہیں اور بولتے بھی ہیں تو معذرت کے ساتھ مختصر اظہارِ خیال کرتے ہیں۔

ایسے لوگ کیا کریں! ظاہر ہے کہ ایک حد تک صبر سے کام لینا پڑتا ہے۔

یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ہم اور وہ تمام لوگ جو کسی بھی سطح پر دین کی خدمت کرتے ہیں، اُن کی ساری حرکت اور سرگرمی کے لیے علمائے دین روحِ رواں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمیں قدم قدم پر اُن سے رہنمائی لینی پڑتی ہے۔ وہ مصلحت و تدبیر کی عام بحثوں کے دوران میں ہمیں کسی اہم دینی اصول یا حکم کی طرف توجہ دلا کر ہم پر بڑا احسان کرتے ہیں۔ ہم اپنی تقریروں کے لیے اُن کے درس و گفتگو سے مواد حاصل کرتے ہیں۔ اور اُن سے سیکھے ہوئے نکات سے ہم تحریروں میں وزن پیدا کرتے ہیں۔

اگر علمائے گرامی قدر ہمارے ساتھ ہو کر قدم قدم پر ہماری رہنمائی نہ کرتے اور ضروریاتِ دین اور مقاماتِ خطر سے آگاہ نہ کرتے تو نری انقلابیت نہ جانے ہمیں کہاں سے کہاں لے جاتی اور ہم اُس مردِ عظیم کے لیے بھی کتنی پریشانی کا باعث ہوتے جس کی پکار پر ہم جمع ہوئے۔

حرفِ آخر یہ کہ ہم جو کام کر رہے ہیں وہ دینی کام ہے، وہ ہماری اختراع و ایجاد تو نہیں کہ اس کا خاکہ جیسے چاہیں بنائیں اور اس میں جس جگہ جو رنگ پسند آئے، بھر دیں۔ دینی کام کتاب و سنّت کے اصول و احکام کے دائرے ہی میں ہو سکتا ہے، لہٰذا کتاب و سنّت سے متعلق علوم کا جاننا ضروری

ہے اور ہم میں سے جو لوگ ان علوم سے واقف ہوں، وہ ہمارے لیے خاص احترام کے مستحق ہیں اور ان کے ساتھ معاملہ صرف شائستگی اور سنجیدگی ہی کے حدود میں کیا جا سکتا ہے۔

تصحیح اغلاط

ترجمہ قرآن مجید مع مختصر حواشی میں حسب ذیل غلطیوں کی اصلاح کر لی جائے۔

صفحہ نمبر	سطر	غلط	صحیح
۳۸۲	۱۰	اَفِدَۃٌ	اَفْئِدَۃٌ
۵۰۶	۶۰	لِیُوَاطِئُوْا	لِّيُوَاطِـُٔوْا
۱۳۰۶	۹	عَلَیَّ	عَلَّیَ
۱۳۲۴	۷	الجِنَّ	الْجِنَّ
۱۳۳۶	۴	اَفَتُمٰرُوْنَہٗ	اَفَتُمٰرُوْنَہٗ
۱۳۳۶	۱۴	نِسَآئِکُمْ	نِّسَآئِکُمْ

تَفْہِیْمُ الْقُرْاٰن جلد پنجم میں حسب ذیل غلطی کی اصلاح کر لی جائے۔

۵۳۴ صفحہ	یَبْعَثُوْا	یُبْعَثُوْا

(گذشتہ سے پیوستہ)

تذکرۂ انبیاء

علیہم السلام

از

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مغفور

باب سوم ——— حضرت نوح علیہ السلام

فصل ۳، ۴

فصل ۳

حضرت نوحؑ کی دعوتِ اصلاح

حضرت نوحؑ کی دعوت کے تین اجزاء

إِنَّآ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ
أَنْ أَنذِرْ قَوْمَكَ مِن قَبْلِ أَن
يَأْتِيَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ قَالَ
يَٰقَوْمِ إِنِّى لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۝
أَنِ ٱعْبُدُوا۟ ٱللَّهَ وَٱتَّقُوهُ
وَأَطِيعُونِ ۝

(نوح - آیات ۲ - ۳)

"ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا (اس ہدایت کے ساتھ) کہ اپنی قوم کے لوگوں کو خبردار کر دے قبل اس کے کہ ان پر ایک دردناک عذاب آئے۔ اس نے کہا: اے میری قوم کے لوگو، میں تمھارے لیے ایک صاف صاف خبردار کرنے والا (پیغمبر) ہوں۔ (تم کو آگاہ کرتا ہوں) کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔"

یہ تین باتیں تھیں جو حضرت نوحؑ نے اپنی رسالت کا آغاز کرتے ہوئے اپنی قوم کے سامنے پیش کیں۔ ایک اللہ کی بندگی۔ دوسرے تقویٰ۔ تیسرے رسول کی اطاعت۔ اللہ کی بندگی کا مطلب یہ تھا کہ دوسروں کی بندگی و عبادت چھوڑ کر اور صرف اللہ ہی کو اپنا معبود تسلیم کر کے اُسی کی پرستش کرو اور اسی کے احکام بجا لاؤ۔ تقویٰ کا مطلب یہ تھا کہ اُن کاموں سے پرہیز کرو جو اللہ کی ناراضی اور اس کے غضب کے موجب ہیں، اور اپنی زندگی میں وہ روش اختیار کرو جو خدا ترس لوگوں کو اختیار کرنی چاہیے۔ رہی تیسری بات کہ "میری اطاعت کرو" تو اس کا مطلب یہ تھا کہ ان احکام کی اطاعت کرو جو اللہ کا رسول ہونے کی حیثیت سے میں تمھیں دیتا ہوں۔

يَغْفِرْ لَكُم مِّن ذُنُوبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ
إِلَىٰٓ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ إِنَّ أَجَلَ ٱللَّهِ
إِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ ۖ لَوْ كُنتُمْ

اللہ تمھارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا اور تمھیں ایک وقت مقرر تک باقی رکھے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت جب آجاتا ہے تو پھر

تَعْلَمُوْنَ ۝ (نوح - آیت ۴) ٹالا نہیں جاتا ۔ کاش تمھیں اس کا علم ہو۔

اصل الفاظ ہیں یَغْفِرْ لَکُمْ مِّنْ ذُنُوْبِکُمْ ۔ اس فقرے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ تمھارے گناہوں میں سے بعض کو معاف کردے گا، بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اگر تم ان تین باتوں کو قبول کرلو جو تمھارے سامنے پیش کی جارہی ہیں تو اب تک جو گناہ تم کرچکے ہو ان سب سے وہ درگزر فرمائے گا۔ (مِنْ تبعیض کے لیے نہیں بلکہ عَنْ کے معنی میں ہے)

اور تمھیں دنیا میں اس وقت تک جینے کی مہلت دے دی جائے گی جو اللہ تعالیٰ نے تمھاری طبعی موت کے لیے مقرر کیا ہے۔ اگر تمھیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہوجائے کہ میرے ذریعے سے اللہ کا پیغام پہنچ جانے کے بعد اب جو وقت گزر رہا ہے یہ دراصل ایک مہلت ہے جو تمھیں ایمان لانے کے لیے دی جارہی ہے، اور اس مہلت کی مدت ختم ہوجانے کے بعد پھر خدا کے عذاب سے بچنے کا کوئی امکان نہیں ہے، تو تم ایمان لانے میں جلدی کروگے اور نزولِ عذاب کا وقت آنے تک اس کو ٹالتے نہ چلے جاؤ گے۔

اللہ کے خوف کی دعوت

ایک مقام پر حضرت نوحؑ کا خطاب ان الفاظ میں آیا ہے:

اُعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے تو کیا تم ڈرتے نہیں ہو۔

یعنی کیا تمھیں اپنے اصل اور حقیقی خدا کو چھوڑ کر دوسروں کی بندگی کرتے ہوئے ڈر نہیں لگتا؟ کیا تم اس بات سے بالکل بے خوف ہوگئے ہو کہ جو تمھارا اور سارے جہان کا مالک و فرمانروا ہے اس کی سلطنت میں رہ کر اس کے بجائے دوسروں کی بندگی و اطاعت کرنے اور دوسروں کی ربوبیت و خداوندی تسلیم کرنے کے نتائج کیا ہوں گے؟

دوسری جگہ یہ الفاظ ہیں:

لہ اس دوسرے وقت سے مراد وہ وقت ہے جو اللہ تعالیٰ نے کسی قوم پر عذاب نازل کرنے کے لیے مقرر کردیا ہو۔ اسی کے متعلق متعدد مقامات پر قرآن مجید میں یہ بات بصراحت بیان کی گئی ہے کہ جب کسی قوم کے حق میں نزولِ عذاب کا فیصلہ صادر ہوجاتا ہے اس کے بعد وہ ایمان بھی لے آئے تو اسے معاف نہیں کیا جاتا۔

اُعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ

(نوح - آیت ۳)

اللہ کی بندگی کرو، اور اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

اس لیے یہاں حضرت نوحؑ کے اشارہ کا مطلب محض خوف نہیں، بلکہ اللہ کا خوف ہے۔ یعنی کیا تم اللہ سے بے خوف ہو گئے؟ اس کے سوا دوسروں کی بندگی کرتے ہوئے تم کچھ نہیں سوچتے کہ اس باغیانہ روش کا انجام کیا ہوگا؟

دعوت کے آغاز میں خوف دلانے کی حکمت یہ ہے کہ جب تک کسی شخص یا گروہ کو اس کے غلط رویے کی بدانجامی کا خطرہ نہ محسوس کرایا جائے، وہ صحیح بات اور اس کے دلائل کی طرف توجہ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ راہِ راست کی تلاش آدمی کے دل میں پیدا ہی اس وقت ہوتی ہے جب اس کو یہ فکر دامن گیر ہو جاتی ہے کہ کہیں میں کسی ٹیڑھے راستے پر تو نہیں جا رہا ہوں جس میں ہلاکت کا اندیشہ ہو۔

نظامِ قدرت سے استدلال

اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۙ وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ۙ وَاللّٰهُ اَنْبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ۙ ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا ۙ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ۙ لِتَسْلُكُوْا فِيْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ۙ

(نوح - آیات ۱۵ تا ۲۰)

کیا دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح سات آسمان تہ برتہ بنائے اور ان میں چاند کو نور اور سورج کو چراغ بنایا؛ اور اللہ تعالیٰ نے تم کو زمین سے عجیب طرح اگایا، پھر وہ تمھیں اسی زمین میں واپس لے جائے گا اور اس سے یکا یک تم کو نکال کھڑا کرے گا اور اللہ تعالیٰ نے زمین کو تمھارے لیے فرش کی طرح بچھا دیا تاکہ تم اس کے اندر کھلے راستوں پر چلو۔

فصل ۴

امین و مخلص داعی

میں ایک بے غرض ناصح ہوں۔ اپنے کسی فائدے کے لیے نہیں بلکہ تمھارے بھلے کے لیے یہ ساری مشقتیں اور تکلیفیں برداشت کر رہا ہوں۔ تم کسی ایسی ذاتی مفاد کی نشاندہی نہیں کر سکتے جو اس امر حق کی دعوت دینے میں اور اس کے لیے جان توڑ محنتیں کرنے اور مصیبتیں جھیلنے میں میرے پیش نظر ہو۔

حضرت نوحؑ کا امین اور مخلص ہونا

"رَسُولٌ اَمِیْنٌ" کے دو مفہوم ہیں۔ ایک یہ کہ میں اپنی طرف سے کوئی بات بنا کر یا کم و بیش کر کے بیان نہیں کرتا بلکہ جو کچھ خدا کی طرف سے مجھ پر نازل ہوتا ہے وہی بے کم و کاست تم تک پہنچا دیتا ہوں۔ اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ میں ایک ایسا رسول ہوں جسے تم پہلے سے ایک امین اور راستباز آدمی کی حیثیت سے جانتے ہو۔ جب میں خلق کے معاملے میں خیانت کرنے والا نہیں ہوں۔ تو خدا کے معاملے میں کیسے خیانت کر سکتا ہوں۔ لہٰذا تمھیں باور کرنا چاہیے کہ جو کچھ میں خدا کی طرف سے بیان کر رہا ہوں اس میں بھی ویسا ہی امین ہوں جیسا دنیا کے معاملات میں آج تک تم نے مجھے امین پایا ہے۔ (۱۲۱)

صداقت نوحؑ کی دلیل

"وَمَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ" صداقتِ نوحؑ کی دلیل ہے۔ پہلی دلیل یہ تھی کہ دعوائے نبوت سے پہلے میری ساری زندگی تمھارے درمیان گزری ہے۔ اور آج تک تم مجھے ایک امین آدمی کی حیثیت سے جانتے رہے ہو۔ اور دوسری دلیل یہ ہے۔ کہ میں ایک بے غرض آدمی ہوں۔ اور تم کسی ذاتی فائدے کی نشاندہی نہیں کر سکتے جو اس کام سے مجھے حاصل ہو رہا ہو، یا جس کے حصول کی میں کوشش کر رہا ہوں۔ اس بے غرضانہ طریقہ سے کسی ذاتی نفع کے بغیر جب میں اس دعوتِ حق کے کام میں شب و روز اپنی جان کھپا رہا ہوں، اپنے اوقات اور اپنی محنتیں صرف کر رہا ہوں اور ہر طرح کی تکلیفیں اٹھا رہا ہوں، تو تمھیں یاد

کرنا چاہیے کہ میں اس کام میں مخلص ہوں، ایمانداری کے ساتھ جس چیز کو حق جانتا ہوں اور جس کی پیروی میں خلق خدا کی فلاح دیکھتا ہوں، وہی پیش کر رہا ہوں کوئی نفسانی جذبہ اس کا محرک نہیں ہے کہ اس کی خاطر میں جھوٹ گھڑ کر لوگوں کو دھوکا دوں۔

یہ دونوں دلیلیں اُن اہم دلائل میں سے ہیں جو قرآن مجید نے بار بار انبیاء علیہم السلام کی صداقت کے ثبوت میں پیش کی ہیں۔ اور جن کو وہ نبوت کے پرکھنے کی کسوٹی قرار دیتا ہے۔ نبوت سے پہلے جو شخص ایک معاشرے میں برسوں زندگی بسر کر چکا ہو اور لوگوں نے ہمیشہ ہر معاملہ میں اسے سچا اور راستباز آدمی پایا ہو، اس کے متعلق کوئی غیر متعصب آدمی مشکل ہی سے یہ شک کر سکتا ہے کہ وہ یکایک خدا کے نام سے اتنا بڑا جھوٹ بولنے پر اُتر آئے گا کہ اسے نبی نہ بنایا گیا ہو اور وہ کہے کہ خدا نے مجھے نبی بنایا ہے۔ پھر دوسری اس سے بھی اہم تر بات یہ ہے کہ ایسا سفید جھوٹ کوئی شخص نیک نیتی کے ساتھ تو نہیں گھڑا کرتا۔ لامحالہ کوئی نفسانی غرض ہی اس فریب کاری کی محرک ہوتی ہے۔ اور جب کوئی شخص اپنی اغراض کے لیے اس طرح کی فریب کاری کرتا ہے تو اخفا کی تمام کوششوں کے باوجود اس کے آثار نمایاں ہو کر رہتے ہیں۔ اسے اپنے کاروبار کو فروغ دینے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرنے پڑتے ہیں جن کے گھناؤنے پہلو گردوپیش کے معاشرے میں چھپائے نہیں چھپ سکتے اور مزید برآں وہ اپنی پیری کی دکان چمکا کر کچھ نہ کچھ اپنا بھلا کرتا نظر آتا ہے، نذرانے وصول کیے جاتے ہیں، لنگر جاری ہوتے ہیں، جائدادیں بنتی ہیں۔ زیور گھڑے جاتے ہیں اور فقیری کا آستانہ دیکھتے ہی دیکھتے شاہی دربار بنتا چلا جاتا ہے۔ لیکن جہاں اس کے برعکس نبوت کا دعویٰ کرنے والے شخص کی ذاتی زندگی ایسے فضائلِ اخلاق سے لبریز نظر آئے کہ اس میں کہیں ڈھونڈھے سے بھی کسی فریب کارانہ ہتھکنڈے کا نشان نہ مل سکے، اور اس کام سے کوئی ذاتی فائدہ اُٹھانا تو درکنار، وہ اپنا سب کچھ اسی خدمتِ بے مزد کی نذر کر دے۔ وہاں جھوٹ کا شبہ کرنا کسی معقول انسان کے لیے ممکن نہیں رہتا۔ کوئی شخص جو عقل بھی رکھتا ہو اور بے انصاف بھی نہ ہو، یہ تصور نہیں کر سکتا کہ آخر ایک اچھا بھلا آدمی جو اطمینان کی زندگی بسر کر رہا تھا، کیوں بلاوجہ ایک جھوٹا دعویٰ لے کر اٹھے، جبکہ اسے کوئی فائدہ اس جھوٹ سے نہ ہو، بلکہ وہ الٹا اپنا مال، اپنا وقت اور اپنی ساری قوتیں اور محنتیں اس کام میں کھپا رہا ہو اور بدلے میں دنیا بھر کی دشمنی مول لے رہا ہو۔ ذاتی مفاد کی قربانی آدمی کے مخلص ہونے کی سب سے زیادہ نمایاں دلیل ہوتی ہے۔ یہ قربانی کرتے جس

کو سالوں بیت جائیں۔ اسے بدنیت یا خود غرض سمجھنا خود اس شخص کی اپنی بدنیتی کا ثبوت ہوتا ہے جو ایسے آدمی پر الزام لگاتا ہے۔ (۱۴۲)

میری اطاعت کرو

حضرت نوحؑ کا مطالبہ قوم سے یہ تھا کہ میرے رسولِ امین ہونے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ تم دوسرے سب مطاعوں کو چھوڑ کر صرف میری اطاعت کرو۔ اور جو احکام میں تمہیں دیتا ہوں ان کے آگے سر تسلیم خم کر دو، کیونکہ میں خداوندِ عالم کی مرضی کا نمائندہ ہوں، میری اطاعت خدا کی اطاعت ہے اور میری نافرمانی محض میری ذات کی نافرمانی نہیں بلکہ براہِ راست خدا کی نافرمانی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول کا حق صرف اتنا ہی نہیں ہے، کہ جن لوگوں کی طرف وہ رسول بنا کر بھیجا گیا ہے وہ اس کی صداقت تسلیم کر لیں اور اسے رسولِ برحق مان لیں، بلکہ اس کو خدا کا سچا رسول مانتے ہی آپ سے آپ یہ بھی لازم آجاتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے اور ہر دوسرے قانون کو چھوڑ کر صرف اسی کے لائے ہوئے قانون کا اتباع کیا جائے۔ رسول کو رسول نہ ماننا، یا رسول مان کر اس کی اطاعت نہ کرنا، دونوں صورتیں دراصل خدا سے بغاوت کے ہم معنی ہیں۔ اور دونوں کا نتیجہ خدا کے غضب میں گرفتار ہونا ہے۔ اسی لیے ایمان اور اطاعت کے مطالبے سے پہلے "اللہ سے ڈرو" کا تنبیہی فقرہ ارشاد فرمایا گیا۔ تاکہ ہر مخاطب اچھی طرح کان کھول کر سن لے۔ کہ رسول کی رسالت تسلیم نہ کرنے یا اس کی اطاعت قبول نہ کرنے کا نتیجہ کیا ہوگا۔

میں کوئی اجر نہیں مانگتا

سورۂ شعراء میں اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ سے فَاتَّقُوا اللّٰہَ کے فقرے کی مناسبت یہ تھی کہ جو شخص اللہ کی طرف سے ایک امانت دار رسول ہے، جس کی صفت امانت سے تم لوگ خود بھی واقف ہو، اسے جھٹلاتے ہوئے خدا سے ڈرو۔ اور یہاں مَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ سے اس فقرے کی مناسبت یہ ہے کہ جو شخص اپنے کسی ذاتی فائدے کے بغیر محض اصلاحِ خلق کے لیے پورے اخلاص کے ساتھ کام کر رہا ہے اس کی نیت پر حملہ کرتے ہوئے خدا سے ڈرو۔ اس بات کو اتنا زور دے کر بیان کرنے کی وجہ یہ تھی۔ کہ قوم کے سردار حضرت نوحؑ کی مخلصانہ دعوتِ حق میں کیڑے ڈالنے کے لیے ان پر یہ الزام لگاتے تھے، کہ یہ شخص دراصل ساری دوڑ دھوپ اپنی بڑائی کے لیے کر رہا ہے۔ یُرِیْدُ اَنْ یَّتَفَضَّلَ عَلَیْکُمْ (المومنون۔ رکوع ۲) یہ چاہتا ہے کہ تم پر فضیلت حاصل کرے۔

نفاذِ شریعت میں تدریج

از جناب ابوالفتح محمد صغیر الدین
(صدر شعبہ تقابلِ ادیان و ثقافت اسلامی جامعہ سندھ)

اِس بات پر اُمت کا اجماع ہے کہ پورا قرآن بتدریج حسبِ ضرورت کم وبیش ۲۳ سال تک نازل ہوتا رہا۔ تدریجاً قرآن کے نازل ہونے کی حکمت خود قرآن پاک میں اس طرح مذکور ہے۔

وقال الذین کفروا لولا نزل علیه القرآن جملة واحدة کذٰلك لنثبت به فؤادك ورتلناه ترتیلا ؕ (الفرقان - ۳۲)

(کافر لوگ یوں کہتے ہیں کہ یہ قرآن ان پر دفعۃً کیوں نازل نہیں کیا گیا۔ اس طرح اس لیے ہے تاکہ ہم اس کے ذریعے سے آپ کے دل کو قوی رکھیں اور ہم نے اس کو بہت ٹھیر ٹھیرا کر اُتارا ہے)۔

ایک دوسری آیت میں ہے:

وقرانا فرقناه لتقرأه علی الناس علی مکث ونزلناه تنزیلا (الاسراء - ۱۰۶)

(اور قرآن میں ہم نے جا بجا فصل رکھا تاکہ آپ اس کو لوگوں کے سامنے ٹھیر ٹھیر کر پڑھیں اور ہم نے اس کو اُتارنے میں بھی تدریجاً اُتارا)

اِن آیات سے معلوم ہوا کہ تدریجاً قرآن کے نازل کرنے کی غرض ایک تو یہ تھی کہ آپ اس کو لوگوں

کے سامنے ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں۔ دوسرے یہ کہ آپ کے دل کو قوی رکھنا مقصود تھا۔ کیونکہ اگر پوری کتاب ایک بار نازل کر دی جاتی تو نامہ و پیام کا سلسلہ منقطع ہو جاتا۔ پہلی وحی نے جس طرح آپؐ کے آتشِ شوق کو بھڑکا دیا تھا، اس کے پیش نظر مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ یہ سلسلہ جاری رہے اور اس میں انقطاع نہ ہونے دیا جائے۔ ہر حادثے اور ضرورت کے وقت جدید پیام کے آنے کی صورت میں اور اس طرح پیام کا سلسلہ جاری رہنے میں آپ کو جو سُرور حاصل ہوتا ہوگا وہ تو احاطۂ بیان سے باہر ہے اور ظاہر ہے کہ سُرور تقویت قلب کا باعث ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ غور کیا جائے تو اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس طریقے سے یہ کتاب تحریف و حذف و زیادتی سے محفوظ ہو گئی، کیونکہ اگر پوری کتاب ایک مرتبہ نازل ہو جاتی تو اس کو کثیر التعداد گروہ میں پھیلانا اور اس حد تک مشہور کر دینا کہ تواتر کی حد تک پہنچ جائے، ناممکن تھا۔ لیکن جب چند آیتیں نازل ہوتیں تو بہت آسان تھا کہ اس مختصر سے کلام کو تواتر کی حد تک پہنچا دیا جائے اور تمام لوگ اس کو یاد کر لیں۔ توریت کے نزول کو پیش نظر رکھا جائے تو تدریج کی حکمت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ پورے کا پورا ایک ہی دفعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا کیا گیا تو اُن کی قوم پر اس کا قبول کرنا مشکل اور بار ہو گیا اور ماننے سے انکار ہی کر دیا۔ جب پہاڑ اُن پر لٹکا دیا گیا تب جا کر انھوں نے اس کو قبول کیا۔ اگر ایک ہی بار بہت سے اوامر و نواہی اور فرائض و واجبات بتا دیے جائیں تو آدمی تشویش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور اُن پر عمل مشکل ہوتا ہے، بخلاف اس کے کہ ایک ایک دو دو احکام دیے جائیں تو آسانی اور خوش دلی سے اُن پر عملدرآمد کرنے لگتا ہے۔

سیوطی نے اتقان (جلد اوّل صفحہ ۴۲) میں بحوالہ امام بخاریؒ حضرت عائشہؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

انما نزل اول ما نزل منه سورة من المفصل فيها ذكر الجنة والنار، حتی اذا ثاب الناس الی الاسلام، نزل الحلال والحرام، ولو نزل اول شیء لا تشربوا الخمر لقالوا لا ندع الخمر ابدا، ولو نزل لا تزنوا لقالوا لا ندع الزنا ابدا۔

(یعنی پہلے مفصل کی وہ آیتیں نازل ہوئیں جن میں جنت اور دوزخ کا ذکر تھا۔ یہاں

تک کہ جب لوگ اسلام کی طرف مائل ہو گئے اور اس پر جم گئے تو حلال و حرام کی آیتیں نازل ہوئیں۔ اگر پہلے ہی یہ کہا جاتا کہ شراب نہ پیو تو یہ لوگ کہتے کہ ہم کبھی شراب نہ چھوڑیں گے اور اگر ان سے کہا جاتا کہ زنا نہ کرو تو لوگ کہتے کہ ہم کبھی زنا نہ چھوڑیں گے)۔

اللہ تعالیٰ جو انسانی فطرت سے سب سے زیادہ واقف ہے اور حکیم و رحیم بھی ہے۔ اس کی حکمت و رحمت کا تقاضا یہی تھا کہ احکام اپنے بندوں پر اس طرح نازل کرے کہ ان کا حفظ و ضبط آسان ہو اور اُن پر عمل کرنا ایسا دشوار نہ ہو جائے کہ گھبرا کر انکار ہی کر بیٹھیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہجرت سے قبل قرآن کا جس قدر حصہ نازل ہوا اس میں اِن تین بنیادی باتوں کا ذکر ہے۔

۱۔ توحید ۲۔ رسالت ۳۔ آخرت۔

۱۔۔۔ توحید سب سے پہلا بنیادی عقیدہ ہے جو ان کے دلوں میں راسخ کیا گیا۔ یعنی یہ کہ اللہ ہی لائقِ عبادت ہے، وہی نفع و ضرر کا مالک ہے، اس کے سوا کوئی ذات ایسی نہیں جس سے نفع کی اُمید کی جائے یا کسی کے ضرر سے خوف کھایا جائے، وہی تمام چیزوں کا خالق و مالک ہے۔ اس کے احاطۂ علم و قدرت سے کوئی شے باہر نہیں، وہ ہمارے تمام احوال و اعمال سے باخبر ہے۔

۲۔۔۔ رسالت کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے ہر زمانہ اور ہر قوم میں رسولوں کو بھیجتا رہا ہے تاکہ لوگ ان کی تعلیمات کے مطابق عمل کر کے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کریں اور اُن کو اپنے عمل کے لیے نمونہ بنائیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس سلسلہ کی آخری کڑی ہیں کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ چنانچہ ساری دُنیا میں قیامت تک آپ ہی کے طریقہ پر عمل ہوتا رہے گا۔ اور اسی طریقہ کو اللہ تعالیٰ کی رضا اور پسندیدگی حاصل ہے۔

۳۔۔۔ آخرت سے مراد یہ ہے کہ انسان کی زندگی اسی دُنیا تک محدود نہیں کہ مرنے کے بعد ہڈیاں بوسیدہ ہو گئیں اور بس معاملہ ختم ہو گیا، بلکہ ایک وقت ایسا آنے والا ہے کہ جب تمام لوگ دوبارہ زندہ کیے جائیں گے اور اللہ کے پاس لوٹائے جائیں۔ اور اس دُنیا میں جو کچھ کیا ہے اُس کا حساب ہر شخص کو دینا ہو گا۔ اگر نیک عمل کیا ہے تو اُس کا اجر ملے گا اور بُرائی کی ہے تو اُس پر سزا ملے گی، اور وہاں کا اجر یا سزا ابدی ہے۔ مختصر یہ کہ اپنے تمام اعمال کی جواب دہی کرنی ہو گی۔ کوئی چھوٹا یا بڑا عمل اللہ کی نگاہ سے مخفی نہیں کہ وہ حساب سے رہ جائے۔

تیرہ سال تک اِن عقائد کی تعلیم دی گئی اور اُن کے ذہنوں میں ان کو بالکل راسخ کر دیا گیا — ایک ایسے خدا پر اُن کا یقین محکم کیا گیا جو ہر شخص کے اعمال و احوال بلکہ دل میں پیدا ہونے والے خیالات اور وسوسوں سے بھی واقف اور باخبر ہے۔ چنانچہ ایمان لانے والے خدائے واحد کے پرستار بن گئے اور عملی دُنیا میں صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنے پر راضی ہو گئے۔ پھر آخرت کی جوابدہی کا احساس اس قدر قوی ہو گیا کہ اگر کسی سے بشری کمزوری کی بنا پر کسی گناہ کا ارتکاب ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے گناہ کا اعتراف کر کے خود اپنی ذات پر شرع کی مقرر کردہ سزا کو نافذ کرایا، کیونکہ انہیں اس کا یقین تھا کہ آخرت کی سزا بہت ہی تکلیف دہ ہو گی، اس خوف سے دُنیا ہی میں اس کی سزا قبول کرنا تاکہ آخرت کی سزا سے محفوظ رہیں۔ پھر اس اعترافِ جرم پر انہیں یہ سند ملی کہ یہ ایسی توبہ ہے کہ تمام اہل مدینہ کو اپنی وسعت میں ڈھانپ لے۔

اس قسم کی اخلاقی بلندی اُن حضرات کو اِن ہی عقائد کی بنا پر حاصل ہوئی تھی جن پر ۱۳ سال تک اُن کو پختہ کیا گیا تھا۔ پھر یہ حال ہوا کہ کسی حکم کے نازل ہونے پر اپنے دل میں چون وچرا کی گنجائش نہیں پاتے تھے بلکہ کوئی حکم نازل ہوتا تو فوراً بلا پس و پیش اس پر عمل شروع کر دیتے۔ حکم کو نافذ کرنے کے لیے کسی جبر کی ضرورت نہ تھی۔ شراب کی حرمت اس کی بین مثال ہے کہ پہلے تو اس کی خرابی ذہن نشین کرائی گئی۔ پھر نشہ کی حالت میں نماز سے منع فرمایا گیا۔ اس کے بعد جا کر اُس کی حرمت کا اعلان کیا گیا اور جب اعلان ہوا تو سبوں نے شراب کے مٹکے انڈیل دیئے اور شراب گلیوں میں بہنے لگی۔

گویا یہی ترتیب فطری ہے کہ پہلے عقائد محکم ہوں۔ لوگوں کے ذہن تبدیل کیئے جائیں۔ پھر احکام دیئے جائیں۔ اسی لئے ہجرت سے قبل جس قدر آیات نازل ہوئیں وہ عقائد سے تعلق رکھتی ہیں اور احکام کے متعلق جس قدر آیتیں نازل ہوئیں وہ مدینہ میں نازل ہوئیں۔ فرائض و احکام اور عبادات میں اسی ترتیب و تدریج کا اصول کارفرما رہا۔ ایسا نہیں ہوا کہ کسی عبادت کے متعلق تمام احکام یکبارگی نازل کر دیئے گئے ہوں۔ بلکہ ہر حکم کو آہستہ آہستہ نافذ کیا گیا۔

اگرچہ احکام و عبادات کی تاریخ کا بیان مقصود نہیں لیکن مثال کے طور پر چند احکام و عبادات کا اجمالاً ذکر کیا جاتا ہے کہ کس طرح ایک ایک حکم اور عبادات میں تدریجی عمل کا ظہور رہا۔

نماز — چونکہ تین سال تک دعوت پوشیدہ طور پر دی جاتی رہی نیز کفار کے ڈر سے دن کو علانیہ نماز

پڑھنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے پہلے تو صرف رات کو دیر تک نماز پڑھتے رہنے کا حکم تھا۔ دن میں کوئی نماز فرض نہ ہوئی۔ رات کو اس طویل نماز کا نام تہجد تھا۔ پھر صبح و شام کی دو رکعتیں فرض ہوئیں۔ شب معراج میں پانچ وقت کی نمازیں فرض ہوئیں لیکن رکعتیں دو ہی رہیں۔ جب مدینہ منورہ میں اطمینان کی صورت نصیب ہوئی تو رکعات کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ قبلہ بدل گیا۔ نماز میں خشوع و خضوع اور اس کے آداب و ارکان جو اب تک لازمی نہیں تھے، رفتہ رفتہ ان کی بھی تکمیل کی گئی۔ نماز میں آسمان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ممانعت کر دی گئی۔ اور نماز کے دوران باتیں کرنے سے روک دیا گیا۔ سلام کرنا یا اس کا جواب دینا ممنوع ہو گیا۔ مہاجرین حبشہ جب مدینہ پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت نماز میں مشغول تھے۔ معمول کے مطابق ان لوگوں نے سلام کیا۔ لیکن آپؐ نے اس وقت جواب نہیں دیا۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپؐ نے فرمایا کہ اب خدا نے حکم دیا ہے کہ نماز میں باتیں نہ کرو۔ تشہد کے الفاظ سکھائے گئے، طہارت کے طریقے سکھائے گئے، اوقات کی تعیین کی گئی، اذان کی تعلیم دی گئی، اس طرح رفتہ رفتہ نماز کی ہیئت خشوع و خضوع اور اس کے لوازمات وجود میں آئے جن پر مسلمان آج عمل پیرا ہیں۔

روزہ اسلام سے پہلے قریش عاشورہ کے روزے رکھتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کا روزہ رکھتے تھے اور غالباً صحابہ بھی آپ کی پیروی میں یہ روزہ رکھتے ہوں گے۔ حضرت جعفرؓ نے نجاشی کے دربار میں جو تقریر کی تھی اس میں روزہ کا بھی ذکر ہے۔ پھر جب آپؐ مدینہ تشریف لائے تو دیکھا کہ یہود بھی اس دن کا روزہ رکھتے ہیں۔ آپ نے اس کی وجہ دریافت فرمائی تو لوگوں نے بتایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسی دن فرعون کے ہاتھ سے نجات پائی۔ آپؐ نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کی تقلید کا تو ہم کو زیادہ حق ہے۔ چنانچہ یہاں بھی آپؐ نے عاشورہ کا روزہ رکھا۔ پھر ۲ھ میں رمضان کے روزے فرض ہوئے تو عاشورہ کا روزہ مستحب ہو گیا۔ یعنی جس کا جی چاہتا تھا یہ روزہ رکھتا تھا اور جو نہیں چاہتا تھا نہیں رکھتا تھا۔ لیکن آپؐ نے اس دن کا روزہ برابر رکھا۔ یہود اس طرح روزہ رکھتے تھے کہ نمازِ عشاء کے بعد پھر نہیں کھاتے تھے اور اس کو حرام سمجھتے تھے۔ ہم بستری بھی ممنوع تھی۔ چنانچہ ابتدا میں مسلمان بھی اس طریقہ کے موافق مامور تھے۔ لیکن بعد میں صبح صادق تک کھانے پینے اور تمام اشغال کی اجازت دے دی گئی اور سحری کھانے کی فضیلت بیان کی گئی۔

اور یہ بھی بتایا گیا کہ سحری صبح تک قریب کھائی جائے۔ نیز یہ کہ جب روزے کی فرضیت نازل ہوئی تو پہلے یہ اختیار تھا کہ جو شخص چاہے روزہ رکھے اور جو چاہے روزہ کے بدلے ایک غریب کو کھانا کھلا دے۔ رفتہ رفتہ جب لوگ روزہ کے خوگر ہو گئے تو فدیہ کی اجازت جاتی رہی۔ البتہ جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو اس کے لیے یہ حکم ہوا کہ اس وقت چھوڑ دے اور ان کے بدلے کسی اور وقت قضا کرے۔

زکوٰۃ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی ترغیب تو ابتدائے اسلام سے ہی دی جاتی تھی لیکن مدینہ منورہ میں کچھ زیادہ تاکید کی گئی۔ صدقہ فطر ۲ھ میں عید کے دن واجب قرار دیا گیا — ہجرت کے بعد ابتدائی زمانہ میں مسلمانوں کی حالت بہت خراب تھی۔ اس لیے حکم ہوا کہ جو کچھ اپنی ضرورت سے بچ جائے، سب خیرات کر دیا جائے۔ چنانچہ صدقہ اور خیرات کا اس قدر شوق پیدا ہو گیا کہ جو لوگ نادار تھے وہ بھی شوق رکھتے تھے کہ مزدوری ملے تو خیرات دی جائے۔ لیکن زکوٰۃ فتح مکہ کے بعد ۸ھ میں فرض کی گئی اور اس کے مصارف بیان کیے گئے۔ ۹ھ میں محصلین روانہ کیے گئے۔

حج عرب میں حج کا سلسلہ تو پہلے ہی سے جاری تھا۔ لیکن چونکہ کفار نے اس میں بہت سی غلط رسمیں ایجاد کر رکھی تھیں، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں اصلاحات کیں۔ مثلاً ننگے ہو کر طواف کرنا، گھروں میں دروازوں سے داخل نہ ہونا، اور اس طرح کی دیگر رسوم کو موقوف کیا گیا۔ پھر آخر میں مشرکین کو حج کی ممانعت کر دی گئی اور ان کا داخلہ حرم میں ممنوع قرار دے دیا گیا۔

صدیوں تک باطل نظام ہائے زندگی کے تحت زندگی گزارنے کی وجہ سے ہماری عادتیں بگڑ کر پختہ ہو چکی ہیں۔ اس لیے جاہلیت جدیدہ کا یہ دور بھی جاہلیت قدیمہ کے دور سے اس لحاظ سے مختلف نہیں کہ غیر مسلم کا تو کہنا ہی کیا، مسلم بھی اسلامی نظام کی افادیت اور اس کے قابل عمل ہونے کی جانب سے تذبذب اور بے یقینی کا شکار ہیں۔ اس لیے پہلے بے یقینی کی جگہ یقین پیدا کرنا ہو گا، اور احکام کے نافذ کرنے میں کچھ ترجیحات اختیار کرنی ہوں گی اور سوچنا پڑے گا کہ کس حکم کو پہلے نافذ کرنا ہے اور کس کو بعد میں؟ کیونکہ یہی فطری طریقہ کار ہے۔

اس سلسلہ میں پہلے تو مساجد کے نظام کو مستحکم اور از سر نو مربوط کر کے ان کے ائمہ سے کام لیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ یہ نظم موجود ہے لیکن شکستہ حال ہے۔ اِس کو فعال بنایا جا سکتا ہے۔ مسجدوں کے متعلق ایک عام تاثر یہ ہے کہ وہاں صرف نماز پڑھنے کے لیے جانا چاہیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ نمازی ہیں وہی مسجد میں جاتے ہیں اور باقی لوگوں کا مسجدوں سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ کوئی رشتہ دار مر گیا تو مسجد میں جا کر قرآن خوانی کرا لی یا میت کو مسجد کے پاس لے جا کر اُس کی نمازِ جنازہ پڑھوا لی یا ثواب کی غرض سے مسجدوں میں چراغاں کا اہتمام اپنے خرچ سے کرا دیا۔ مساجد کو تمام لوگوں کے لیے پُرکشش بنانے کی ضرورت ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ دُنیاوی ضرورتیں بھی مساجد سے وابستہ کر دی جائیں تو لوگ لامحالہ مسجدوں میں جانے اور اُن سے تعلق رکھنے پر مجبور رہیں گے۔ نماز یا عبادات کا فوری فائدہ محسوس نہیں ہوتا۔ اِس لیے بہت کم لوگ مساجد کا رُخ کرتے ہیں۔ اگر دُنیوی ضرورتیں بھی وہاں سے پوری ہونے لگیں تو لوگ مجبوراً مساجد کی طرف جائیں گے۔ وہاں نماز بھی ادا کریں گے اور نماز پڑھنے کے جو فوائد اخلاقی معاشرتی ہیں وہ حاصل ہوں گے۔ اُن کا یہ یقین آہستہ آہستہ پختہ ہوتا جائے گا کہ مسجد میں جانے سے صرف آخرت ہی نہیں بلکہ دُنیا بھی ملتی ہے اس طرح دین و دُنیا کا فرق اُن کے ذہن سے دُور ہوتا جائے گا اور شرعی احکام کا بجا لانا اُن کے لیے آسان ہوتا جائے گا۔ ابتداءً تجربہ کے طور پر یہ چیزیں کرنے کی ہیں۔

۱۔ زکوٰۃ و صدقات کی تقسیم مساجد کے ذریعے کرائی جائے۔

۲۔ ہر مسجد کے ساتھ ایک حلقہ آبادی کا مخصوص کر دیا جائے کہ وہاں رہنے والوں کے گھروں کے احوال و کوائف کا ریکارڈ ائمہ مساجد کے پاس ہو۔

۳۔ راشن کے کام کی نگرانی، راشن کارڈ اور شناختی کارڈ کے حصول اور اس طرح کے دیگر سرٹیفکیٹ کے اجراء کا حق ائمہ مساجد کو دیا جائے۔

۴۔ محلہ کے جھگڑوں کے تصفیہ میں ائمہ مساجد کا اثر پیدا کیا جائے۔

۵۔ ائمہ مساجد پہلے تو لوگوں کو وعظ و تبلیغ کے ذریعے، پھر زجر و توبیخ کے ذریعے اہلِ محلہ کو مسجد میں آنے پر مجبور کریں۔ مہینہ میں ایک یا دو بار اہلِ محلہ کے مسائل اور اُن کے حل کے لیے مشاورت

کے طور پر نماز کے اوقات میں میٹنگ طلب کریں تاکہ لوگ نماز میں شریک ہونے کے بعد اپنے مسائل پیش کریں اور اُن کے حل کی تدابیر پر غور کریں۔

۶ - ایسے ائمہ کا تقرر کیا جائے جو باوقار اور باصلاحیت ہوں، جھگڑالو یا متعصب نہ ہوں، فرقہ وارانہ بحثوں میں نہ اُلجھیں، اور اکثریت اُن کے طرزِ عمل سے مطمئن ہو۔

غرض اس طرح کی بہت سی ایسی صورتیں ہیں جن کے ذریعے مساجد کو پرکشش بنا کر لوگوں کے ذہنوں میں تبدیلی پیدا کی جاسکتی ہے۔

امام ترمذیؒ

۲۰۹ھ تا ۲۷۹ھ

جناب عبد الرشید عراقی

نام و نسب محمد نام، ابو عیسیٰ کنیت۔ قبیلہ بنو سلیم سے تعلق رکھتے تھے۔ ۲۰۹ھ میں ترمذ میں پیدا ہوئے۔[1]

تحصیلِ علم امام ترمذی جس دور میں پیدا ہوئے۔ اس زمانے میں علمِ حدیث اکنافِ عالم میں پھیل چکا تھا۔ خراسان اور ماوراءالنہر کو تو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ حضرت امام نے جب ہوش سنبھالا، تو انہیں علمِ حدیث کی تحصیل کا شوق دامن گیر ہوا۔ چنانچہ آپ نے تحصیلِ حدیث کے لیے مختلف ملکوں کا سفر کیا۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

"کہ آپ نے خراسان، عراق اور حجاز کا سفر کیا۔"[2]

اساتذہ و شیوخ امام ترمذی نے اپنے زمانے کے مشہور اساتذہ سے استفادہ کیا جو اپنے فن میں اساطین تھے۔ تاہم اُن کے مشہور اساتذہ و شیوخ یہ ہیں۔ امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام ابوداؤدؒ

---

[1] معجم البلدان ج ۲ ص ۳۸۲

[2] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۸۹

علی بن حجر مروزی، قتیبہ بن سعید اور امام محمد بن بشار۔ البتہ سب سے زیادہ استفادہ امام ترمذی نے امام بخاریؒ سے کیا۔ علامہ ذہبی نے لکھا ہے:

• "تفقہ فی الحدیث بالبخاریؒ"[1]

امام بخاریؒ کو بھی اپنے لائق شاگرد پر ناز تھا، اور آپ نے ان الفاظ میں یہ سند عطا فرمائی:

"ما انتفعت بک اکثر مما انتفعت بی"[2] یعنی

جتنا فائدہ آپ نے مجھ سے حاصل کیا اُس سے زیادہ مَیں نے آپ سے حاصل کیا۔

اور مولانا سید انور شاہ کشمیری (م ۱۳۵۲ھ) فرماتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ذہین شاگرد جب استاد سے سوال کرتا ہے تو اُس کی نگاہ دیگر دوسیع تر علوم کی طرف جاتی ہے[3]

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (م ۱۲۰۹ھ) فرماتے ہیں:۔

"ترمذی شاگرد رشید بخاری است، و روشِ او را آموختہ و از مسلم و ابی داؤد، و شیوخ ایشان نیز روایت دارد۔ و در بصرہ و کوفہ و واسط و رے و خراسان و حجاز سالہا در علم حدیث بسر بردہ"[4]

تلامذہ قابلِ قدر اور ممتاز اساتذہ و شیوخ کی طرح آپ کے تلامذہ بھی قابلِ قدر اور ممتاز علمی مقام کے حامل تھے۔ چند مشہور تلامذہ یہ ہیں:۔

ابوحامد احمد بن عبد مروزی، ہیثم بن کلاب شاشی، ابو العباس احمد محمد بن محبوب المروزی، احمد بن یوسف لسفی، محمد بن محمود اور داؤد بن نصر مروزی[5]

قوتِ حفظ میں انبیاء اللہ تعالیٰ جب کسی سے کوئی بڑا کام لینا چاہتا ہے تو اُس کے اسباب بھی پیدا کر دیتا ہے۔ حضرت امام ترمذی کو جس طرح اکابر محدثین سے استفادہ کا موقع ملا، ویسے ہی خدا داد قوتِ حفظ

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۸۹۔ [2] ایضاً۔

[3] العرف الشذی ص ۲۸۔ [4] بستان المحدثین ص ۱۲۔

[5] محدثین عظام اور ان کے علمی کارنامے۔ ص ۱۹۶۔

بھی عطا کی گئی تھی۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اُن کے حافظہ کے سلسلہ میں یہ عجیب وغریب حکایت بیان کرتے ہیں کہ:-

"ایک دفعہ مکہ معظمہ کے راستہ میں ایک شیخ مل گئے۔ اُن سے حدیث کے دو اجزاء سُن کر نقل کر لیے تھے۔ لیکن عرض و قرأت کی فرصت میسر نہیں ہوئی تھی۔ ان سے سماع کی درخواست کی جو انہوں نے منظور کرلی۔ انہوں نے فرمایا۔ دونوں جزء لیتے آؤ تاکہ تمہیں ان سے مقابلہ کرنے میں آسانی ہو۔ اب سوءِ اتفاق یہ کہ وہ دونوں جزء گم ہو چکے تھے۔ مجبوراً خالی ہاتھ جا کر تلامذہ کے حلقہ میں بیٹھ گئے۔ شیخ نے حدیث بیان کرنا شروع کی۔ اچانک اُن کی نظر جو پڑی تو کیا دیکھتے ہیں کہ یہ سفید کاغذ ہاتھ میں لیے حدیث سُن رہے ہیں۔ شیخ اس پر بگڑے کہ تم ہم سے مذاق کر رہے ہو۔ مرقومہ جزء کہاں ہیں۔ امام ترمذی نے فرمایا کہ حضور وہ تو گم ہو گئے ہیں، البتہ وہ حدیثیں لوح و قلم پر مرتسم ہیں۔ اور مرتسم بھی ایسی کہ کاغذ کا کیا حوصلہ جو ان کو یوں سینے میں محفوظ رکھ سکے۔ شیخ نے کہا۔ اچھا سناؤ۔ چنانچہ امام ترمذی نے فرفر وہ دونوں جزء سنا دیئے۔ اس پر شیخ کو حیرت ہوئی۔ انہوں نے کہا، ممکن ہے یہ احادیث تمہیں پہلے سے یاد ہوں۔ امام ترمذی نے فرمایا، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا، ابھی سبھی اسی نشست میں امتحان ہو جائے۔ اِس پر شیخ نے ۴۰ احادیث ایسی منتخب کیں جو دوسروں کے پاس نہیں ہو سکتی تھیں۔ وہ سنائیں اور اعادہ کا مطالبہ کیا۔ امام ترمذیؒ نے پورے اسناد کے ساتھ من وعن سب احادیث سنا دیں۔ اس پر شیخ کو اُن کے غیر معمولی حافظہ پر تعجب ہوا[1]۔

زہد و تقویٰ | زہد و تقویٰ میں ایک ممتاز مقام کے حامل تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ:-

"و ورع و زہد بحدسے داشت کہ فوق آں متصور نیست۔ بخوفِ الٰہی بسیار گریہ زاری کرد و نابینا شد[2]"

---

[1] بستان المحدثین ص ۱۲۱ [2] ایضاً ص ایضاً

"یعنی زہد وتقویٰ اس درجہ کا حاصل تھا کہ اس سے زیادہ کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا، اور خوفِ الٰہی سے بکثرت گریہ وزاری کیا کرتے تھے، یہاں تک کہ آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔"

بعض حضرات کی رائے ہے کہ امام ترمذیؒ مادرزاد اندھے پیدا ہوئے تھے، لیکن حافظ ابن حجرؒ نے اس کی تردید کی ہے[1]۔

خدا کا یہ ڈر، خشیتِ الٰہی کا یہ انداز ، محدثین کے مقام کو اتنا اونچا کر دیتا ہے کہ عام مصنفین وہاں تک نہیں پہنچ پاتے، جو لوگ اللہ سے اس طرح کا معاملہ رکھتے ہوں۔ وہ حدیث کی صیانت و حفظ، اور اشاعت میں کتنے محتاط اور ذمہ دار ہوں گے، اس کا احساس ان لوگوں کو نہیں ہو سکتا جو علم کے ساتھ عمل کو ضروری نہیں سمجھتے، نیز جو قرآن پڑھتے ہیں۔ اور اس کے علوم و معارف کی اشاعت کا دم بھی بھرتے ہیں، مگر اللہ کے ساتھ کبھی انہوں نے لو نہیں لگائی۔ اس کے ساتھ محبت و سوز کے مراسم نہیں پیدا کیے، اس کے لیے دلوں میں گداز کی کیفیتیں نہیں پیدا کیں، اور کبھی اللہ کے ڈر کا تصور کر کے اپنے اُوپر کپکپی طاری نہیں کی۔

ایک ضروری وضاحت ترمذی کے نام سے [illegible] یں تین حضرات مشہور ہیں۔ اس لیے اکثر لوگ مغالطے میں پڑ جاتے ہیں۔ حالانکہ تینوں کے درجات مختلف [illegible]۔

۱۔ امام ابو عبد[illegible] [illegible] صاحب سنن ہیں۔

۲۔ ابو الحسن احمد بن حسن۔ یہ ترمذی کبیر کے لقب سے مشہور ہیں، اور امام احمد کے تلامذہ میں سے ہیں۔

۳۔ حکیم ترمذی صاحب نوادر الاصول۔

تصانیف امام صاحب کی تصانیف حسب ذیل ہیں:۔

جامع ترمذی۔ کتاب العلل۔ المفرد۔ التاریخ۔ الزہد۔ الشمائل۔ الاسماء والکنی۔ کتاب التاریخ[2]۔

شمائل الترمذی یہ مقدس کتاب جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نشست و برخاست، کھانے پینے، رہنے سہنے، سلام، کلام، لباس کی وضع قطع، کنگھی کرنے، موزے پہننے، اور لوگوں کے ساتھ ملنے جلنے

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۸۸۔

[2] تدریب الراوی ص ۲۶۰ فہرست ابن ندیم ص ۲۸۸۔

اور عام اخلاق کی حدیثوں کی جامع کتاب ہے۔ عاشقانِ سیرتِ نبوی کے لیے یہ کتاب گنجینہ مراد ہے۔ مسلمانوں کا تو فرض ہے کہ اپنے اخلاق، عادات، لباس، نشست و برخاست، کھانے پینے، سلام کلام میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے کو ہم رنگ بنائیں جس سے موجودہ نکبت دور ہو، اور دنیا اخلاقِ محمدی کا نمونہ دیکھ کر گرویدۂ اسلام ہو جائے[1]

علامہ جزری صاحبِ "حصن حصین" کتاب الشمائل کی مدح میں فرماتے ہیں کہ:-

اخلای ان شط الحبیب وربعہ
وعز تلاقیہ وناء منان لہٗ
فان فاتکم ان تبصروہ بعینہ
فما فاتکم بالسمع عنہ شمائلہ

میرے دوستو! محبوب اور اس کا مکان تم سے دور ہو گیا اور ملاقات مشکل ہو گئی۔ پس آنکھ کی ملاقات نصیب نہیں تو اس کے اخلاق و شمائل کا سننا نہیں گیا[2]

جامع الترمذی حدیث کی جس کتاب میں آٹھ قسم کے مضامین بیان کیے جائیں، اس کو جامع کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور وہ آٹھ قسم کے مضامین جامع یہ ہیں:-

۱- سیر، ۲- آداب، ۳- تفسیر، ۴- عقائد، ۵- فتن، ۶- احکام، ۷- اشراط ۸- مناقب۔

چونکہ ترمذی ان آٹھوں قسم کے مضامین پر مشتمل ہے، اس لیے اس کو جامع کہا جاتا ہے اور چونکہ ترتیبِ فقہی کے اعتبار سے زیادہ تر احکام کی احادیث لائے ہیں، اس لیے اس پر "سنن" کا اطلاق بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ پہلے کتاب الطہارت لائے ہیں، اس کے بعد کتاب الصلوٰۃ۔ پھر زکوٰۃ و صوم وغیرہ۔

ترمذی کی خصوصیات امام ترمذی فرماتے ہیں کہ اس کتاب کو لکھ کر میں نے علمائے حجاز کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے اس کو پسند فرمایا۔ اور علمائے خراسان کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے تحسین فرمائی، اور سب نے بیک زبان ہو کر یہ فیصلہ دیا کہ:-

---

[1] سیرۃ البخاری ص ۲۵۴۔ [2] ایضاً۔

"جس گھر میں یہ کتاب ہو گویا اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم گفتگو فرما رہے ہیں"۔[۱]

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ:۔

"ترمذی کی جامع ان کی کتابوں میں سے بہتر تصنیف ہے"۔[۲]

امام ابو اسمٰعیل عبداللہ بن محمد انصاری ہروی فرماتے ہیں کہ:۔

"میرے نزدیک ترمذی کے فوائد بخاری و مسلم سے زیادہ انفع ہیں۔ کیونکہ بخاری و مسلم سے فائدہ صرف عالم متبحر ہی اٹھا سکتا ہے۔ اور امام ابو عیسیٰ کی کتاب سے ہر شخص مستفید ہو سکتا ہے"۔[۳]

بڑی بڑی خصوصیات یہ ہیں:۔

۱۔ ترتیب نہایت سادہ اور سہل، کہیں تکرار یا اعادہ نہیں۔

۲۔ وقت کے تمام فقہی مذاہب کی ترجمانی، ان کے دلائل، اور وجوہِ استدلال کا تذکرہ اور اپنی رائے کا اظہار۔

۳۔ انواع حدیث کی وضاحت، یعنی کہ یہ حدیث کیسی ہے، یعنی صحیح، حسن، ضعیف، غریب، معلل، مرسل وغیرہ درجات کی وضاحت۔

۴۔ راویوں کے نام، ان کی کیفیات اور القاب کا استیعاب، پھر رجال کے متعلق، فوائد علمیہ کا بیان اور تفصیل۔

۵۔ ترتیب کی یہ خوبی کہ وہ شخص بھی استفادہ کر سکے جو مرتبۂ اجتہاد پہ فائز ہے اور وہ بھی جو عامی ہے۔[۴]

جامع ترمذی کی شروح و حواشی جامع ترمذی کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر علماء اور محدثین نے اس کے ساتھ پورا اعتناء کیا ہے۔ اور اس کی متعدد شروح، حواشی اور مستخرجات لکھے ہیں۔

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰۸ [۲] بستان المحدثین ص ۱۲۰ [۳] تدریب الراوی ص ۵۵

[۴] اب یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ امام ترمذی کا مسلک کیا ہے۔ مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیری (م ۱۳۵۲ھ) فرماتے ہیں کہ "امام ترمذی شافعی مسلک کے تھے"۔ (العرف الشذی ص ۴) (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

مولانا عبدالسلام مبارک پوری (م ۱۳۴۲ھ) نے جامع ترمذی اور شمائل ترمذی کی ۱۳ شروح کا ذکر کیا ہے[۱]۔ چند ایک مشہور شروح یہ ہیں:

۱۔ عارضۃ الاحوذی فی شرحِ جامعِ ترمذی از ابن العربی مالکی (م ۵۴۶ھ)

۲۔ اللب اللباب فیما یقول الترمذی وفی الباب از ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ)

۳۔ قوت المغتذی علی جامع الترمذی از امام جلال الدین السیوطی (م ۹۱۱ھ)

۴۔ شرح الجامع الترمذی از امام ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ)[۲]

۵۔ شرح الجامع الترمذی از ابوالحسن بن عبدالہادی السندی المدنی (م ۱۱۳۹ھ)[۳]

برصغیر پاک و ہند میں الجامع الترمذی کے شروح و حواشی

برصغیر پاک و ہند میں جید علمائے کرام نے الجامع الترمذی کے شروح و حواشی لکھے ہیں۔ جہاں تک مجھے اس سلسلہ میں رسائی ہوسکی ہے، تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ ہدایۃ اللوذعی بنکات الترمذی (عربی) از علامہ شمس الحق ڈیانوی (م ۱۳۲۹ھ) (غیر مطبوعہ)۔ اس شرح میں علاوہ متن کے اسانید کے متعلق بڑی نفیس تحقیقات لکھی گئی ہیں[۴] اور مشکل مقامات کا حل بڑی تفصیل سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) اوپر آپ پڑھ چکے ہیں کہ امام ترمذی امام بخاری کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، اس لیے اُن پر مجتہدانہ رنگ غالب تھا۔ اور امام ترمذیؒ کے اس قول سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جسے وہ اکثر استعمال کرتے ہیں۔ یعنی "عند اصحابنا"

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی فرماتے ہیں کہ: "محدثین کا کسی امام کی کثرتِ موافقت کی وجہ سے اسی مذہب کی طرف انتساب کیا جاتا ہے۔"

اور اس قول سابقہ متعلقہ کتب سے اس کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ امام ترمذی نے بعض مسائل میں امام شافعیؒ سے اختلاف کیا ہے اور امام ولی اللہ دہلوی کے قول کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ امام ترمذیؒ شافعیؒ نہیں تھے، بلکہ مجتہد مطلق تھے۔ (مولفِ مضمون)

[۱] سیرۃ البخاری ص ۴۲۵ تا ۴۳۴۔ [۲] امام ابن حجر نے فتح الباری میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

[۳] سیرۃ البخاری ص ۴۲۷، ۴۲۸ [۴] ایضاً ص ۴۲۸

کیا گیا ہے۔[۱]

۲۔ تحفۃ الاحوذی فی شرح جامع الترمذی (عربی ۴ جلد) از امام عبدالرحمان مبارک پوری (م ۱۳۵۳ھ)
یہ ایک بہت علمی اور گرانقدر شرح ہے۔ اس شرح میں مصنفِ علام نے درج ذیل امور کی تفصیل سے نشاندہی کی ہے۔

ا۔ جامع ترمذی کے ہر راوی کا ترجمہ بقدرِ ضرورت لکھا گیا ہے۔ اور مقدمہ شرح میں تمام راویوں کی فہرست بہ ترتیب حروفِ تہجی سے دی گئی ہے اور جس راوی کا ترجمہ شرح کے جس صفحہ پر مذکور ہے۔ اس کا نشان دے دیا گیا ہے۔

ب۔ جامع ترمذی کی تمام حدیثوں کی تخریج کی گئی ہے۔ یعنی اس کتاب کی حدیثوں کو امام ترمذی کے علاوہ اور جن محدثین نے اپنی کتابوں میں روایت کیا ہے، ان کا اور ان کتابوں کا نام بتا دیا گیا ہے۔

ج۔ امام ترمذی نے "و فی الباب" کے عنوان سے جن احادیث کی طرف اشارہ کیا ہے، اُن کی مفصل تخریج کی گئی ہے، اور ان احادیث کے الفاظ بھی اکثر مقامات میں نقل کیے گئے ہیں — احادیث مشار الیہ کے علاوہ دیگر احادیث کی تخریج کا بھی جا بجا اضافہ کیا گیا ہے۔

د۔ تصحیح و تحسین حدیث میں امام ترمذی کا تساہل مشہور ہے۔ اس لیے ہر حدیث کی تحسین و تصحیح کے متعلق دیگر ائمہ فنِ حدیث کے اقوال بھی نقل کیے گئے ہیں، نیز جن احادیث کی تصحیح و تحسین میں امام ترمذی سے تساہل ہوا ہے۔ اُن کی تصریح کر دی گئی ہے۔

ر۔ اسنادی و متنی اشکالات کے حل و ایضاح کی طرف خاص طور پر توجہ کی گئی ہے۔

س۔ احادیث کی توضیح و تشریح میں بہت کچھ تحقیق سے کام لیا گیا ہے۔ جن مقلدین جامدین اور جن اہل ہوا نے احادیث نبویہؐ کو اپنے مذہب و مسلک پر منطبق کرنے کے لیے غلط اور واہی تاویلیں اور تقریریں کی ہیں، ان کی تاویلات و تقریرات کی کافی تغلیط و تردید کر دی گئی ہے۔ احادیث کے صحیح مطالب و مضامین جو سلف صالحین اور فقہاء محدثین کے نزدیک معتمد و مستند ہیں بیان کیے گئے ہیں

[۱] ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات ص ۴۵

ص ۔ اختلاف مذاہب کے بیان میں ہر مذہب کے دلائل بیان کر کے مذہب حق و راجح کو ظاہر کر دیا گیا ہے ۔ اور اس کی نصرت و تائید کی گئی ہے ۔ مذاہب مرجوحہ و غیر صحیحہ کے دلائل کے شافی جواب دیئے گئے ہیں ۔

ط ۔ آثار السنن (للشوق النیموی) وغیرہ کی جا بجا لطیف اور قابلِ دید تنقید کی گئی ہے[1] ۔

۳ ۔ مقدمہ تحفۃ الاحوذی ۔ مولانا مبارک پوری نے شرح مذکور کا ایک مبسوط مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے جو مستقل طور پر علیحدہ طبع ہو کر شائع ہوا ہے ۔ یہ مقدمہ دو باب اور خاتمہ پر مشتمل ہے ۔ پہلے باب میں ۴۱ فصلیں ہیں جن میں عام فنونِ حدیث، کتبِ حدیث اور ائمہ حدیث کے متعلق نہایت کار آمد اور ضروری فوائد جمع کر دئے گئے ہیں ۔ دوسرا باب ۱۷ فصلوں پر مشتمل ہے جن میں خاص جامع ترمذی اور امام ترمذی کے متعلق بہت ضروری اور غایت درجہ مفید مباحث مذکور ہیں ۔ باب ثانی جن نادر اور قیمتی فوائد پر مشتمل ہے ۔ ان کا جاننا جامعِ ترمذی کے طالب علم کے لیے از بس ضروری ہے ۔ ان مباحث کو پڑھے بغیر جامع ترمذی کا پڑھنا اور پڑھانا بے معنی اور لا حاصل ہے ۔ مقدمہ میں مختلف مناسبتوں سے ۱۱۵ ائمہ حدیث و تفسیر و فقہ و لغت کے تراجم بھی آگئے ہیں ۔ اس کی تمام خوبیوں کا سرسری اندازہ شروع میں ملحقہ فہرست سے ہو جاتا ہے جو ۱۲ صفحات پر مشتمل ہے ۔ مقدمہ کا حجم ۲۴۴ صفحات ہے ۔ آخر میں مصنف علام کا مختصر ترجمہ ملحق ہے ۔ مکمل شرح مع مقدمہ مبارک پور سے شائع ہوئی تھی[2] اور اب مستقبل قریب میں اس کا فوٹو ایڈیشن بیروت سے شائع ہوا ہے[3] ۔

۴ ۔ العرف الشذی علی جامع الترمذی (عربی) از مولانا رشید احمد گنگوہی (م ۱۳۲۳ھ) مولانا مرحوم کی تقاریر کا مجموعہ ہے[4] ۔

۵ ۔ الکوکب الدری علی جامع الترمذی (عربی) از مولانا رشید احمد گنگوہی (م ۱۳۲۳ھ) ۔ مولانا مرحوم کی

---

[1] سیرۃ البخاری ص ۴۳۰

[2] تحفۃ الاحوذی کی کتابت مولانا محمد ابراہیم کے والد ماجد مولانا محمد اسماعیل السلفی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۳۸۷ھ) سابق امیر جمعیۃ اہل حدیث پاکستان نے کی تھی ۔

[3] سیرۃ البخاری ص ۴۳۱

[4] دار العلوم دیوبند نمبر ص ۱۵۵

تقاریر درس کا مجموعہ۔[1]

۶۔ العرف الشذی شرح جامع ترمذی از مولانا سید انور شاہ مرحوم (م ۱۳۵۲ھ) کتاب الطہارۃ تک طبع شدہ۔[2]

۷۔ معارف السنن شرح سنن الترمذی (عربی) از مولانا محمد یوسف بنوری (م ۱۳۹۷ھ / ۱۹۷۷ء) یہ جامع ترمذی کی بے نظیر محققانہ شرح ہے۔ ۶ جلدوں میں کتاب المناسک لکھی گئی ہے۔ کتاب الجنائز سے آخر تک کا حصہ باقی رہ گیا ہے۔ عوارف المنن مقدمہ معارف السنن کے نام سے مقدمہ شامل ہے مگر صرف دو تہائی حصہ لکھا گیا تھا کہ شارح کا انتقال ہو گیا۔[3]

۸۔ حاشیہ جامع ترمذی (عربی) از شیخ الہند مولانا محمود الحسن (م ۱۳۳۹ھ)۔[4]

۹۔ النفح الشذی شرح الترمذی (اردو) از مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (م ۱۳۲۳ھ) مولانا مرحوم کی تقاریر درس۔[5]

۱۰۔ جائزۃ الشعوزی ترجمہ جامع الترمذی از مولانا وحید الزمان حیدر آبادی (م ۱۳۳۸ھ) یہ جامع ترمذی کی مکمل اور مفصل شرح ہے۔[6]

۱۱۔ ترجمہ جامع ترمذی اردو، از مولانا فضل حق دہلوی مرحوم۔[7]

۱۲۔ ترجمہ ترمذی اردو۔ از مولانا بدیع الزمان حیدر آبادی (م ۱۳۰۴ھ) یہ مولانا وحید الزمان حیدر آبادی کے برادر اکبر تھے۔ (م ۱۳۳۸ھ) ان کا ترجمہ جامع ترمذی کا مکمل اور مفصل ترجمہ مع تشریح ہے۔ اس سے مفصل اور مکمل ترجمہ و تشریح برصغیر میں شائع نہیں ہوا۔[8]

امام ترمذی کی وفات آپ کی وفات ۲۷۹ھ میں ہوئی۔ بوقت وفات آپ کی عمر ۷۰ سال تھی۔[9]

---

[1] دار العلوم دیوبند نمبر ص ۱۵۵ [2] سیرۃ البخاری ص ۱۳۴

[3] بینات اشاعت خاص تیموری نمبر ص ۶۷ [4] دار العلوم دیوبند نمبر ص ۱۵۹ [5] ایضاً

[6] ہندوستان میں علمائے اہل حدیث کی علمی خدمات۔۔ ص ۴۵

[7] ایضاً ص ۴۵ [8] ایضاً ص ۴۵

[9] اتحاف النبلاء ص ۲۸۷۔

رسائل و مسائل

اسقاط، ماتم اور ختم کی شرعی حیثیت

از جناب ملک غلام علی صاحب ناظم شعبہ استفسارات

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین چند مسائلِ ذیل میں:

۱۔ ہمارے علاقہ میں عرصہ دراز سے ایک رسم ذیل چلی آ رہی ہے کہ جب کوئی مرد عورت بالغ وفات پا جاتا ہے تو اُس کی نجات کے لیے بعد نماز جنازہ چند ایک علماء دائرہ کی صورت بنا کر بیٹھ جاتے ہیں اور وہ قرآن پاک جس کو جنازہ کے ساتھ لایا جاتا ہے اور قرآن پاک کے ساتھ ہی کوئی مقرر کردہ نقد رقم بھی رکھی جاتی ہے۔ اُس کو دائرہ میں چکر کی طرح ایک دوسرے کی ملک کرتے جاتے ہیں یہ چکر تین بار میں پورا کیا جاتا ہے اور بعدہٗ وہی مذکورہ رقم اُس دائرہ میں امیر غریب قاضی علماء مفتی درویش پر تقسیم کی جاتی ہے اور پھر دُعا کے ساتھ ختم کی جاتی ہے۔ اس رسم کو حیلہ کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے اور اس کو اسقاط کا نام دیا جاتا ہے۔

۲۔ جب جنازہ اُٹھا کر قبرستان لے جایا جاتا ہے تو اُس وقت بھی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ مرد اور عورتیں قریب قریب ہو کر چلتی ہیں اور قبر پر حاضر ہو جاتی ہیں اور مرد جنازہ کرنے کے بعد جب دفن کے لیے میّت کو قبر پر لاتے ہیں تو عورتیں وہاں بھی بین کرتی ہیں۔

۳۔ یہ بھی ایک رسم چلی آ رہی ہے کہ جب کوئی وفات پاتا ہے تو ورثا چاہے یتیم ہوں یا بیوہ ہو امیر ہو یا غریب ہو۔ گھر کا مال ہو یا قرضہ اُٹھا کر عام کھانا پکایا جاتا ہے جس دن کہ وفات کا دن ہوتا ہے وہ کھانا امیر غریب، ممبر نمبردار، علماء قاضی سب کھاتے ہیں اور اُس کو خیرات کا نام

دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اُس دن ماتم والوں کو کھانا کھلانا ضروری ہے۔

ان تمام مذکورہ رسومات ۱ تا ۱۳ میں جو آدمی شرکت نہ کرے تو اُس پر غیر مقلد کا فتویٰ لگا کر عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ عام لوگوں کا یہ مطالبہ ہے کہ مذکورہ رسومات اگر قرآن اور حدیث کے منافی ہیں تو مکمل فتویٰ منگوا کر ہم کو مطمئن کیا جائے۔ آپ کا ادارہ ایک دینی ادارہ ہے اور تمام پاکستان میں آپ کا فتویٰ جاری ہوتا ہے۔

۱ تا ۱۳ کو قرآن و حدیث اور فقہ کی روشنی میں مفصل تحریر فرما کر ثواب دارین حاصل کریں۔ واضح رہے کہ ہمارا مسلک حنفی ہے۔

جواب:-

۱- مروجہ حیلۂ اسقاط کے حق میں کوئی ثبوت یا دلیل کتاب و سنّت، آثارِ صحابہ یا اقوالِ فقہاء میں مذکور نہیں۔ مستفسر نے لکھا ہے کہ ہمارا مسلک حنفی ہے۔ اس لیے براہ راست کتاب و سنّت سے عمومی دلائل کو سردست بیان نہ کرتے ہوئے اور اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے صرف فقہی حوالہ جات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

فقہ حنفی کی مشہور کتاب ردالمحتار، کتاب الصلوٰۃ، باب قضاء الفوائت، مطلب فی اسقاط الصلوٰۃ عن المیت کے تحت علامہ ابن عابدین شامی فرماتے ہیں:-

"ثم اعلم انه اذا اوصى بفدية الصوم يحكم بالجواز قطعاً لانه منصوص عليه۔ واما اذا لم يوص فتطوع بها الوارث فقد قال محمد في الزيادات انه يجزيه ان شاء الله تعالى۔ فعلق الاجزاء بالمشيئة لعدم النص، وكذا علقه بالمشيئة فيما اوصى بفدية الصلوٰة لانهم الحقوها بالصوم احتياطاً لاحتمال كون النص فيه معلولا بالعجز فتشمل العلة الصلوٰة وان لم يكن معلولاً تكون الفدية برا مبتدأ يصلح ماحيا للسيئات فكان فيها شبهة، كما اذا لم يوص بفدية الصوم فلذا جزم محمد بالاول ولم يجزم بالاخرين، فعلم انه اذا لم يوص بفدية الصلوٰة فالشبهة اقوى"

ترجمہ:- پھر جان لو کہ جب مرنے والے نے فدیۂ صوم کی وصیت کی ہو تو اُس میں قطعی جواز کا حکم

لگایا جائے گا کیونکہ یہ فدیہ شرعاً منصوص ہے۔ لیکن جب اُس نے وصیت نہ کی ہو اور وارث اس کی طرف سے رضاکارانہ طور پر فدیہ دیں تب بھی امام محمد نے فرمایا کہ انشاء اللہ یہ مفید ہوگا۔ یہاں انہوں نے انشاء اللہ کا لفظ اس لیے کہا ہے کہ اس صورت میں نص موجود نہیں ہے۔ اسی طرح اگر فدیہ صلوٰۃ کے معاملے میں وصیت بھی کی گئی ہو تو اُس کو فقہاء نے احتیاطاً روزے سے ملحق کیا ہے۔ کیونکہ روزہ نہ رکھنے میں عجز کی علت (یعنی روزہ نہ رکھ سکنے کی وجہ) نص حدیث میں موجود ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ یہ علت نماز کو بھی شامل کرے اگرچہ علت موجود نہ ہو۔ یعنی اگر نمازی کا نماز پڑھنا بربنائے علت نہ تھا تو ہو سکتا ہے کہ یہ بُرائیوں کا کفارہ ہو جائے۔ لیکن اس میں شبہ موجود ہے، جس طرح کہ فدیہ صوم کی اگر وصیت نہ کی گئی ہو۔ اس لیے امام محمد نے فدیہ صوم کی وصیت کی صورت میں تو جزم کے ساتھ جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ لیکن روزے یا نماز کی وصیت نہ ہونے کی صورت میں جزم کا فتویٰ نہیں دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر فدیہ صلوٰۃ کی وصیت مرنے والے نے نہ کی ہو تو اس فدیے کا مشتبہ ہونا زیادہ قوی اور راجح ہے)۔

اس بحث سے یہ معلوم ہوا کہ اوّل تو فدیہ کا حکم صرف روزے سے متعلق ہے، جن لوگوں نے اس حکم کو فوت شدہ نمازوں پر بھی منطبق کیا ہے، اُنہوں نے بھی اس میں شک و شبہ کا ساتھ ہی اظہار کیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس میں فدیہ یا کفارہ جو کچھ بھی تجویز کیا گیا ہے وہ اسی کتاب کے متن درمختار میں موجود ہے جس کی یہ کتاب شرح ہے اور اس میں یہ الفاظ ہیں کہ "ولو مات و علیہ صلوٰۃ فائتۃ و اوصٰی بالکفارۃ یعطی لکل صلوٰۃ نصف صاع من بر کالفطرۃ"

(اگر اس نے قضا شدہ نمازوں کے کفارے کی وصیت کی ہو تو ہر فوت شدہ نماز کے عوض میں فطرے کے مانند نصف صاع گندم ہے)

دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ بعض فقہاء نے جس اسقاط کا ذکر کیا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ مرنے والے کے جتنے روزے اور نمازیں بربنائے عذر قضا ہوئی ہیں۔ ان سب کا حساب لگا کر ہر نماز اور ہر روزے کے بدلے میں دو دو سیر، یا پونے دو دو سیر غلہ فقراء مستحقین میں تقسیم کیا جائے لیکن موجودہ زمانے میں جو قرآن مجید یا اُس کے ساتھ تھوڑی سی نقدی یا غلّے کی پوٹلی وغیرہ لکھ دی جاتی ہے

اور اس کو دائرے میں گھمایا جاتا ہے اس کا ثبوت کہیں سے نہیں ملتا۔ یہ تو کتاب اللہ کی بھی توہین ہے اور اس پر اس فدیے کا بھی اطلاق نہیں ہو سکتا جو حدیث میں یا فقہ میں مذکور ہے۔

علامہ شامیؒ نے اپنی اس بحث میں اپنے ایک رسالے کا بھی ذکر کیا ہے جس کا نام "شفاء العليل في بطلان الوصية بالختمات والتهاليل" ہے اور اس کا نام ہی بہ ظاہر کر رہا ہے کہ مرنے والے کے لیے جو اسقاط کے طور پر مروج ختم یا ذکر اذکار کرتے ہیں۔ علامہ شامی نے اپنے رسالے میں اس فعل کا باطل ہونا ثابت کیا ہے۔ اس بحث میں ذرا آگے وہ پھر ایک عنوان "مطلب في بطلان الوصية بالختمات والتهاليل" قائم فرماتے ہیں اور اس کے تحت لکھتے ہیں:۔ "وظهر حال وصايا اهل زماننا، فان الواحد منهم يكون في ذمته صلوة كثيرة وغيرها من زكاة واضاح وايمان ويوصي لذلك بدراهم يسيرة ويجعل معظم وصية لقراءة الختمات والتهاليل التي نص علماءنا على عدم صحة الوصية بها وان القراءة لشئ من الدنيا لا تجوز، وان الآخذ والمعطي آثمان لان ذالك يشبه الاستئجار على القراءة، ونفس الاستئجار عليها لا يجوز، فكذا ما اشبه كما صرح بذلك في عدة كتب من مشاهير كتب المذهب وانما افتى المتاخرون بجواز الاستئجار على تعليم القرآن لا على التلاوة وعللوه بالضرورة وهي خوف ضياع القرآن، ولا ضرورة في جواز الاستئجار على التلاوة كما اوضحت ذلك في شفاء العليل۔"

ترجمہ :۔ "ہمارے اہل زمانہ جو وصیت کرتے ہیں اُس کا حال میری بحث سے ظاہر ہو گیا۔ ان مرنے والوں میں بعض ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کے ذمے بہت سی نمازیں، زکوٰۃ، قربانیاں اور قسموں کے کفارے وغیرہ ہوتے ہیں۔ اور وہ اس کفارے کے لیے چند پیسوں کی وصیت کر دیتے ہیں۔ (آج کل کے زمانے میں تو یہ وصیت بھی مفقود ہے) اور وہ اپنی وصیت میں زیادہ تر یہ کہتا ہے کہ ختم پڑھے جائیں۔ اللہ کا ذکر ہو۔ حالانکہ ہمارے علماء نے اس طرح کی وصیت کی عدم صحت قطعی طور پر بیان کی ہے اور دُنیا کے لالچ میں قرأت کرنا جائز ہی نہیں ہے۔ اور یہ دنیوی مال لینے والا اور دینے والا دونوں گنہگار ہیں کیونکہ یہ قرآن پر اُجرت کے مشابہ ہے۔ حالانکہ اس طرح کی اُجرت فی نفسہ جائز نہیں ہے۔ تو جو اس سے مشابہ چیز ہو گی

وہ بھی اسی طرح ناجائز ہو گی، جس طرح کہ ہمارے مذہب کے مشاہیر کی متعدد کتابوں میں صراحت موجود ہے۔ ہمارے متاخرین فقہاء نے صرف تعلیم قرآن پر اُجرت کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ تلاوتِ قرآن پر اُجرت لینے کا فتویٰ نہیں دیا ہے اور وہ جواز کا فتویٰ دیا ہے تو تعلیمِ قرآن کے معاوضے کو بھی بربنائے ضرورت جائز قرار دیا ہے۔ ورنہ قرآن مجید کے ضائع ہونے کا خوف ہے اور تلاوتِ قرآن پر اُجرت لینا کوئی اس طرح کی ضرورت نہیں ہے۔ جس طرح کہ میں نے اپنی کتاب شفاء العلیل میں (جس کا اُوپر ذکر ہوا ہے) واضح کر دیا ہے۔" آخر میں انہوں نے یہ لکھا ہے کہ حضرت حسنؓ بن علیؓ سے اس فدیہ صلوٰۃ کے بارے میں پوچھا گیا جس کی وصیت مرض الموت میں خود مرنے والا کرے کہ کیا یہ جائز ہے؟ تو انہوں نے فرمایا "نہیں"۔

یہ تو فقہی اقوال کی روشنی میں مختصر جواب ہے لیکن کتاب و سنّت اور فقہائے مجتہدین کی مفصّل آراء کی روشنی میں اس مسئلے میں قولِ فیصل یہ ہے کہ فدیہ یا اسقاط یا کفارہ و بدل وغیرہ کی جو صورتیں بھی مشروع ہیں۔ وہ صرف اس حالت میں ہیں جب کہ کسی مکلف مسلمان کی کوئی عبادت نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ بربنائے عذر فوت یا قضا ہوتی ہو۔ اور اس کوتاہی یا قصور پر اُسے ندامت ہو اور وہ اپنی زندگی ہی میں اُس کی تلافی کی جو شکل شریعت میں مقرر ہے ممکن حد تک کوشش کرے یا کم از کم اس کی تمنا رکھے۔ لیکن جس شخص کے فرائض مسلسل اور کثرت کے ساتھ بلا عذر شرعی ترک ہوتے رہیں۔ وہ اگر زندگی میں بھی محض تطوعات سے (مثلاً نمازوں کے عوض میں کچھ گندم حیلہ اسقاط کے طور پر دے کر) تلافی مافات کی کوشش کرے تو یہ اس کی زندگی میں بھی خود اس کی طرف سے قابلِ قبول نہیں ہے۔ چہ جائیکہ اس کے مرنے کے بعد کچھ دوسرے لوگ اس کی طرف سے یہ حیلہ اختیار کریں۔ اس پر بھی علماء کا اجماع ہے کہ فرائض کی تلافی یا نیابت نوافل سے نہیں ہو سکتی۔ مثلاً کوئی شخص فرض نماز تو نہ پڑھے، زکوٰۃ و عشر واجب ہونے کے باوجود نہ دے تو وہ خواہ کتنے نفل پڑھتا رہے، کتنا صدقہ دیتا رہے۔ اس کے ذریعے سے ترکِ فرائض کا جرم کسی حیلے سے ساقط نہیں ہو سکتا۔

۲۔ جنازے کے ساتھ عورتوں کا چلنا یا میت پر یا میت کے لئے مرد یا عورت کا بین کرنا یعنی آواز کے ساتھ ہائے وائے کرنا اور نوحہ کرنا شرعاً ممنوع ہے۔ الشرح الکبیر شرح منیۃ المصلی جو کبیری کے نام سے معروف ہے۔ اس کے آخر میں ابواب الجنائز میں ہدایہ اور دیگر کتب کے حوالے سے لکھا ہے۔

"لا ینبغی للنساء ان یخرجن مع الجنازۃ وعلیہ الجمہور"

(عورتوں کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ جنازے کے ساتھ نکلیں، جمہور یعنی اکثر فقہا کا فتویٰ یہ ہے) آگے مزید لکھا ہے۔ "لایسئل عن الجواز والفساد فی مثل هذا وانما یسئل عن مقدار ما یلحقها من اللعن فیه واعلم انها کلما قصدت لخروج کانت فی لعنة الله وملائکته واذا خرجت تحفها الشیاطین من کل جانب واذا اتت القبور یلعنها روح المیت واذا رجعت کانت فی لعنة الله ذکره فی التاتارخانیة"

(عورتوں کے جنازے کے ساتھ چلنے کے جواز و فساد کے بارے میں سوال نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ پوچھنا یہ چاہیے کہ اس عورت پر ایسی صورت میں لعنت مسلط ہونے کی مقدار کیا ہے۔ جان لو کہ وہ جب بھی ارادہ کرتی ہے جنازے کے ساتھ نکلنے کا تو اللہ اور اس کے فرشتوں کی لعنت کی زد میں آ جاتی ہے اور جب نکل پڑتی ہے تو ہر طرف سے شیاطین اسے گھیر لیتے ہیں۔ اور اگر وہ قبرستان تک پہنچتی ہے تو اس پر میت کی روح لعنت کرتی ہے اور جب وہ واپس آتی ہے تب بھی اللہ تعالیٰ کی لعنت کے تحت آتی ہے۔ یہ فتاویٰ تاتارخانیہ میں ہے) اس سے ذرا آگے پھر لکھا ہے۔ "وان کان مع الجنازة صائحة ونائحة تزجر وتمنع"
(اگر جنازے کے ساتھ کوئی عورت چیخ و پکار اور بین و بکا کرنے والی ہو تو اسے ڈانٹا جائے اور روکا جائے)

۳۔ ردالمحتار، باب صلوٰة الجنائز "مطلب فی الثواب علی المصیبة" کے تحت لکھا ہے۔
"ویستحب لجیران اهل المیت والاقرباء الاباعد تهیئة طعام لهم یشبعهم یومهم ولیلهم، لقوله صلی الله علیه وسلم "اصنعوا لآل جعفر طعاماً فقد جاءهم ما یشغلهم"۔

(اہل میت کے ہمسایوں اور دور کے رشتہ داروں کے لئے مستحب ہے کہ وہ میت والوں کے لئے کھانا تیار کریں کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جعفرؓ طیار کی وفات کی خبر سن کر فرمایا تھا کہ جعفرؓ کے گھر والوں کے لئے کھانا تیار کرو، کیونکہ ان پر ایسی مصیبت آئی ہے جس نے اسے مشغول و مغموم کر دیا ہے۔)

آگے پھر مطلب فی کراهة الضیافة من اهل المیت کے تحت لکھا ہے۔
"ویکره اتخاذ الضیافة من الطعام من اهل المیت لانه شرع فی السرور ولا فی الشرور وهی بدعة مستقبحة"

میت والوں کی طرف سے کھانے اور ضیافت کا انتظام کرنا مکروہ ہے۔ کیونکہ ضیافت تو خوشی کے مواقع کے لئے

مشروع ہے نہ کہ مصیبت کے وقت کے لئے۔ یہ فعل بہت بری بدعت ہے) پھر آگے مسند احمد اور ابن ماجہ کے حوالے سے حضرت جریرؓ بن عبداللہ سے روایت نقل کی گئی ہے۔

"کنا نعد الاجتماع الی اهل المیت وصنعهم الطعام من النیاحة"

(ہم اہل میت کے ہاں لوگوں کے جمع ہونے اور پھر میت والوں کی طرف سے ان کے کھانے پکانے کو نوحے میں شمار کرتے تھے) (جو شرعاً ممنوع ہے)

اسی مقام پر درمختار کے متن میں، (جس کی ردالمحتار شرح ہے) یہ الفاظ ہیں۔

"ولا باس بالجلوس لها ثلاثة ایام وکره بعدها الا لغائب وتکره التعزیة ثانیاً"

(تین دن تک تعزیت کی نشست کے لئے بیٹھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن اس کے بعد یہ مجلس مکروہ ہے۔ سوائے اس کے کہ کوئی آدمی جنازے سے غائب تھا تو اس کا اگر تعزیت کرنا اور بیٹھنا مکروہ نہیں ہوگا۔ ورنہ دوبارہ تعزیت مکروہ ہے)

دوبارہ تعزیت کے مکروہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ جنازے میں شامل نہیں تھے اور انہوں نے آکر ایک مرتبہ تعزیت کر لی تو ان کا فعل تو درست ہے لیکن جنازے میں شمولیت یا ایک دفعہ تعزیت کر لینے کے بعد دوبارہ تعزیت کے لئے آنا مکروہ ہے۔

مطبوعات

کتاب: سوانح قاسمی
مؤلف: مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم
ناشر: مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار، لاہور
ضخامت: تین حصے دو جلدوں میں
کل صفحات: ۱۳۲۰
قیمت: ہر دو حصہ مجلد/۱۳۵ روپے

برصغیر کی دینی و سیاسی تاریخ میں دیوبند کا ایک درس گاہ کے علاوہ ایک مدرسۂ فکر کی حیثیت سے بڑا مقام ہے اور دیوبند کو جن ہستیوں نے ابتداً دیوبند بنایا تھا، اُن میں صدیقی خاندان کے مولانا محمد قاسم نانوتوی کا خاص مرتبہ ہے۔ اسی ہستی کے متعلق فاضل صاحبِ قلم مولانا مناظر احسن کے قلم سے یہ ضخیم کتاب ہمارے سامنے ہے۔

افسوس ہے کہ کتاب کے شایانِ شان جامع تبصرے کے لیے ہمارے پاس کافی صفحات نہیں ہیں — مختصراً چند باتیں عرض ہیں۔

کتاب میں سوانحی عنصر کافی ہے، مگر اتنا نہیں کہ مولانا نانوتوی کی سوانح نگاری کا حق ادا ہو جائے۔ حقائق و واقعات کو اپنے حسنِ بیان کی وجہ سے مناظر گیلانی صاحب بہت پھیلا کر بیان کرتے ہیں اور قاری کو بہائے جاتے ہیں۔ موضوع کی ضروریات پر لطفِ بیان کا ذوق غالب آ جاتا ہے۔ سوا تیرہ سو صفحے کی اس کتاب میں زیادہ تر مواد ایک تو خاندان اور نسبی احوال پر مشتمل ہے، دوسرے مولانا کی شخصیت کے رنگِ تصوف پر، تیسرے کچھ باتیں مناظروں کے متعلق ہیں — ہم خواہش رکھتے تھے کہ مولانا محمد قاسم کا نظریۂ تعلیم، طریقِ تدریس، اُن کے بعض فتاویٰ، ذاتی اور مدرسے سے متعلق خطوط، نمونے کے بعض درس، ان کی تحریروں کے اقتباسات اس طریق سے سامنے آتے کہ قارئین جان لیتے کہ مولانا قاسم مغفور نے دیوبند اور ملت کو کیا دیا، اور کس نہج پر اپنے طلبہ کی فکری و علمی تعمیر کی۔

یہ اعتراض نہیں، بلکہ ہم نے اپنی ایک حسرت کا اظہار کیا ہے۔ ورنہ مولانا قاسم مغفور کا تذکرہ ہو، اور

مولانا گیلانی مرحوم کا قلم تو ایسی تحریر کو کون قابلِ قدر گردانے گا۔

کتاب: خیر البشرؐ کے ۴۰ جان نثار
مؤلف: طالب ہاشمی
ناشر: البدر پبلی کیشنز۔ لاہور
ضخامت: پونے پانچ سو صفحات
سفید کاغذ
قیمت: مجلد اعلیٰ ۴۲/- روپے

اس کتاب کو اپنے درخشاں موضوع، اور مخلص و قابل مؤلف کی وجہ سے جو قدر و قیمت حاصل ہے، اُس کے پیش نظر میرا ارادہ تھا کہ قدرے تفصیل سے بات کی جائے، مگر "مطبوعات" کے لیے کبھی جگہ نکلتی ہی نہیں اور کبھی دو تین صفحات نکلتے ہیں، اُدھر کتابوں کا ایک انبار رہے۔ لہٰذا مجبوراً اسے مؤخر کرنے سے بہتر یہ سمجھا کہ اجمالاً تعارف کرا دیا جائے۔ مؤلف کچھ ہی عرصہ پہلے "شمع رسالت کے ۳۰ پروانے" نامی کتاب حالاتِ صحابہ کے سلسلے میں لکھ چکے ہیں اور پہلے بھی اس میدان میں خاصا کام کیا ہے، انشاء اللہ آئندہ بھی کریں گے۔ آج اگر طالب ہاشمی کے پیچھے کوئی دار المصنفین موجود ہوتا تو وہ یقیناً چھوٹے سے "شبلی ثانی" شمار ہوتے۔ بیچارے مشکل اشاعتی حالات میں عرق ریزی کر کے کام کر رہے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اگر دنیا میں اعیاتے اسلام کا کام ہونا ہے تو بغیر اس کے نہیں ہو سکتا کہ اسلام کا عملی مفہوم سیرتِ پاک اور سیرِ صحابہ سے اخذ کیا جائے اور یہ جانا جائے کہ اسلامی اجتماعیت کیسی اکائیوں سے بنتی ہے۔ دنیا میں کسی لیڈر اور کسی تحریک کو ویسے مخلص اور جان نثار ساتھی نہیں ملے جیسے آنحضورؐ کے فیضانِ نظر کے تربیت یافتگان مکہ و مدینہ کی تحریکِ انقلاب کو ملے تھے۔ طالب ہاشمی ایسے چالیس مثالی انسانوں کی تجلیات ایمان و اخلاق کو اپنی کتاب کے اوراق پر سجا کر لاتے ہیں۔ طالب صاحب کی تحریر کی رُوح خلوص ہے، جن ہستیوں پر انہوں نے لکھا ہے اُن سے گہری محبت و عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ مؤلفانہ حیثیت سے وہ تحقیق و مطالعہ کے بعد جچے تُلے حقائق سامنے لاتے ہیں۔ اور کمزور باتوں کو چھانٹ دیتے ہیں۔ کوئی مؤرخانہ و سوانحی کام اس اہتمام کے بغیر معیاری نہیں ہو سکتا۔ مزید برآں طالب صاحب بہت اچھی زبان میں لکھتے ہیں جس میں صحت، سنجیدگی اور وقار کا خیال رکھا جاتا ہے اور کوئی مصنوعیت نہیں ہوتی۔

حج، عمرہ اور زیارتِ مزارِ نبوی

مؤلف: محمود الحسن خسرو

ناشر: مؤلف، ۳/۲، سومیراج ۔ پٹیل روڈ گارڈن ویسٹ ۔ کراچی

ضخامت: ۳۲۴ صفحات

قیمت: درج نہیں۔

حج و عمرہ کے موضوع پر راقم کی نظر سے بہت سی کتابیں گذری ہیں، ان میں سے بعض بہت اچھی اور جامع تھیں۔ یہ کتاب بھی بڑی اہم ہے اور مجھے پسند آئی ۔ موضوع سے متعلق تمام مسائل کو کتاب و سنت کے مآخذ کے ساتھ حسنِ ترتیب سے پیش کیا گیا ہے مختلف فقہاء کا نقطۂ نظر سامنے آتا ہے ۔ فقہ حنفی کے احکام کو بھی اجاگر کیا گیا ہے ۔ بہت سے جزئی اور باریک مسائل بھی درج ہیں ۔ بعض مقامات پر صرف ایک پہلو سے کھٹک ہوتی ہے ۔ کہیں کہیں استنباطی اختلافات ۔ کو بیان کر کے قاری کو کسی خاص نتیجے پر پہنچائے بغیر چھوڑ دیا گیا ہے ۔ اس کے سامنے کم سے کم مسلکِ راجح تو واضح ہو جانا چاہیے تھا ۔ بصورت موجودہ ایسے مقامات صرف اہلِ علم کی دلچسپی کا میدان بن سکتے ہیں جو تحقیقی کام کرتے ہوں ۔ علماء کے ساتھ ساتھ عام قاری کی ضروریات کو بھی پوری اہمیت ملنی چاہیے تھی۔

کتاب: چراغِ سنت

مؤلف: مولانا سید فردوس شاہ صاحب

ناشر: مکتبہ نذیریہ ۔ لاہور

ضخامت: ۳۲۷ صفحات

قیمت: ۳۰ روپے

مسلمان کے لیے قرآن کے بعد دوسرا ماخذِ ہدایت سنتِ رسول ہے ۔ اس کے بعد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ کتاب و سنت سے استنباط کردہ ۔ یا اجتہاداً اخذ کردہ احکام و اشارات ہوں پھر قیاس، استحسان اور اجماع کے مخصوص دوائر ہیں ۔

سنت کا احیا کرنا، مسلکِ پیروئ سنت کی دعوت دینا ۔ سنت سے تجاوز کے رجحانات کے غبار کو صاف کرنا دین کی بڑی خدمت ہے ۔

ہم حسنِ ظن رکھتے ہیں مولانا سید فردوس شاہ صاحب کی نیت مسلکِ پیروی سنت پر زور دینا ہے ۔ مگر ان کی اس کتاب پہ مناظرانہ رنگ غالب ہو گیا ہے ۔

دوسری طرف کی مناظرانہ باتوں کو اگر سامنے رکھیں تو سید فردوس شاہ کو ایسے کو تیسا کے اصول پر جواب دینے سے روکا نہیں جا سکتا ۔ مگر دعوتِ اسلامی کا مقصد مناظرانہ طریقوں سے حاصل نہیں ہو سکتا ۔

دوسری جانب کے جو حوالے سید فردوس شاہ صاحب نے درج کئے ہیں، وہ پڑھ کر آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ کیا یہ مسلمانوں کی سی بات چیت ہے۔ مثلاً:

"آج کل کے وہابی، رافضی وغیرہ، ایسا شخص سب سے بدتر مرتد ہے۔ اس سے جزیہ نہیں لیا جا سکتا۔ اس کا نکاح کسی مسلم، کافر، مرتد، اس کے ہم مذہب ہوں یا مخالف مذہب، غرض انسان حیوان کسی سے نہیں ہو سکتا۔ جس سے ہوگا، مرتدوں میں سب سے بدتر منافق ہے۔ خصوصاً وہابیہ دیوبندیہ"

مؤلف نے احکام شریعت ص ۱۱۶ کا حوالہ دیا ہے۔ اصل کتاب یا عبارت نہیں دیکھی جا سکی۔

اب اِدھر کی سُنیے!

"بریلوی حضرات کی اصلاح قرآنِ کریم اور حدیث شریف کے معیاری دلائل سے نہ ہوتی ہے، نہ ہو سکتی ہے۔" (عرض مؤلف)

اور ــــ "چراغ سنت ایک خنجر ہے جو بدعت کی کمر میں پیوست ہو چکا ہے۔" (دیباچہ طبع دوم)

مگر نہ اُدھر کے فتووں سے وہابیت و دیوبندیت ختم ہو سکتی ہے، نہ اِدھر کے خنجر سے بدعت یا بریلویت کا انسداد کیا جا سکتا ہے۔

میرا مشورہ یہ ہے کہ بجائے اس مناظرانہ طرزِ خطاب کے، اگر دردمندانہ اور برادرانہ اور خیرخواہانہ انداز میں ایک دوسرے کو تلقین کی جائے، کفر کے فتووں سے اجتناب کیا جائے اور یہ نقطۂ نظر ختم کر دیا جائے کہ ہر اختلاف کرنے والے کا قلع قمع کر دینا ہے تو شاید دین کی خدمت زیادہ بہتر طور پہ کی جا سکتی ہے۔

مثلاً "چراغ سنت" میں جن حقیقتوں کو بیان کیا گیا ہے، انہیں اگر سید فردوس شاہ صاحب کسی خاص فرقے کو نشانہ بنائے بغیر اور کسی کا نام لیے بغیر خالص اصولی اور مثبت طور پر بیان کرتے اور جن غلط چیزوں کو وہ غلط کہنا چاہتے ہیں، انہیں بھی سنجیدگی سے غلط ثابت کرتے تو یہ کتاب زیادہ قیمتی اور وسیع الاثر ہوتی۔

یہی مشورہ ہمارا دوسرے فریق کے لیے ہے، بلکہ ہر مذہبی گروہ کے لیے!

اگر مناظرانہ رنگ سے قطع نظر کر لیا جائے تو اس کتاب میں بہت سے مفید حقائق مذکور ہیں اور سنت

کے حق میں دلائل اور حوالے موجود ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ سید فردوس شاہ صاحب اس کو دوبارہ علمی و تحقیقی سطح پر لکھیں۔

کتاب: اعترافِ عظمت
مرتب: عین الحسنین نون
ناشر: مکتبۂ تعمیر انسانیت۔ اُردو بازار۔ لاہور
ضخامت: ۵۶۵ صفحات
سفید کاغذ۔ مجلد
قیمت: ۳۵/- روپے

عالمی تحریکاتِ اسلامی کے مشترک رہنما اور مفکر اسلام سید ابوالاعلیٰ مودودی مغفور و مرحوم کی وفات پر لکھے جانے والے مضامین، تاثرات، اخباری نوٹ، بیانات، مناظر سفرِ آخرت، سانحہ کے متعلق انٹرویوز کا یہ ایک اچھا مجموعہ ہے۔ مشاہیر اہل قلم کے تاثرات یکجا کر دیے گئے ہیں۔

اُمید ہے کہ یہ مجموعہ مولانائے مغفور کی سوانح، ان کی فکر، اُن کے کام، اُن کے مزاج، اُن کے سفرِ آخرت کے مختلف مراحل کے متعلق مفید معلومات و تاثرات کو سامنے لاتا ہے۔

کتاب: ائمہ سلف اور اتباع سنت
مصنّف: شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ
مترجم: پروفیسر غلام احمد حریری۔
ناشر: طارق اکیڈیمی۔ فیصل آباد
صفحات: ۱۳۲۔ سفید کاغذ۔ چھوٹا سائز
قیمت: رنگین ٹائیٹل کے ساتھ ۸/- روپے

موضوع بھی بڑا اہم ہے اور مؤلف بھی عظیم المرتبہ۔ چھوٹی سی کتاب واضح کرتی ہے کہ ائمہ سلف خواہ وہ محدثین ہوں یا فقہا۔ اتباعِ سنت کے اصول پر مضبوطی سے قائم ہے۔ فرق صرف اس بنا پر ہوتا ہے کہ بعض ائمہ کو کوئی خاص حدیث پہنچی اور بعض کو پہنچی ہی نہیں۔ اسی طرح کوئی حدیث ایک فریق کی نگاہ میں روایت و درایت کو پورا کرتی ہے۔ دوسری نہیں کرتی۔ اس کے باوصف بڑے بڑے احکام میں مختلف بزرگ اسلاف تقریباً یک آہنگ ہیں۔ تفصیلی احکام میں جزئی اختلافات ہیں۔ مگر ان اختلاف نے کبھی کوئی بڑی تفریق پیدا نہیں کی۔ سارے فقہاء و محدّثین کی سمتِ سفر ایک ہی تھی۔ اور قدم سے قدم ملا کر آگے بڑھے۔ فقہی اختلافات کی بنیاد پر تفرقہ

تو پیروان آئمہ کا پیدا کردہ ہے۔

اس مختصر سی کتاب کو پڑھ کر شریعت کے بہت سے اہم گوشے سامنے آتے ہیں اور فقہ کا دروبست سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔

کتاب: تنقید و تحریک
مؤلف: ڈاکٹر احمد سجاد ایم اے ڈی لٹ
ناشر: گہوارۂ ادب - طارق منزل
بریاتو - رانچی - انڈیا
ضخامت: ۱۲۸ صفحات، مجلد مع سرورق
قیمت: -/۲۵ روپے

ادب کے دائرے میں تو فلاحی و تعمیری کام خاصا ہوا، مگر تنقید کے میدان میں یا تو مغربی معیارات کے ساتھ کام ہوا یا اشتراکی نقطہ نظر۔ بقول ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (جنہوں نے پیش رس لکھا ہے) —— "بنے بنائے فارمولے، اوڑھے ہوئے نظریات، دل و دماغ پر تالے پڑے ہوئے، اور چابی ایسی جگہ پر جہاں آرام طلبی اور تساہل کے ہاتھ پہنچ نہیں پاتے۔ ان حالات میں اگر کوئی اپنے ذہن سے سوچتا اور اپنی زبان سے بات کرتا ہوا نظر آتا ہے تو مسرت ہوتی ہے۔" (ص: د) کیا خوب کہا ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب نے کہ: "افق ادب پر ایک نیا محقق طلوع ہونے والا ہے"۔ (ص-ف)

ڈاکٹر سجاد کے اصولی تصورات میں سے ایک یہ ہے کہ "ادبی عمل باندازِ جمال ہوتا ہے"۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ: "میں چونکہ حیات و کائنات کو انتہائی بامعنی اور بامقصد سمجھتا ہوں —— اور سی ای ایم جوڈ کے اس نتیجۂ فکر کی پوری تائید کرتا ہوں کہ یہ بات ہمارے لیے ناقابل برداشت ہے کہ بالعموم کائنات، اور بالخصوص انسانی زندگی کا کوئی مقصد یا نصب العین نہ ہو، اور مادے کے اجزا لایعنی طور پر بے مقصد، خواہ مخواہ اِدھر اُدھر حرکت کرتے پھر رہے ہوں۔" (ص: ۲،۱) ساتھ ہی وضاحت کر دی کہ ادب میں نری مقصدیت اور پند و نصیحت یا غیر ادبی اظہار کو ادب کے منافی خیال کرتا ہوں۔ (ص: ۳) پھر لکھا کہ: "میری ناچیز رائے میں انسانی زندگی میں اخلاقی قدروں کو جو اہمیت حاصل ہے وہی اہمیت ادب میں بھی اُن کو حاصل ہے۔" (ص-۳) مگر ادب میں اخلاقی قدروں کا ایجابی پہلو، جذباتی اور جمالیاتی انداز میں ہونا چاہیے۔" (ص-،) ڈاکٹر صاحب توازن و اعتدال کے بہت قائل ہیں اور کتاب میں آراء کا اظہار توازن و اعتدال ہی سے کیا ہے۔

ڈاکٹر احمد سجاد جنہوں نے "ڈی لٹ" کی ڈگری کے لیے میر غلام علی عشرت بریلوی (متوفی ۱۸۲۱ء) پر

مقالہ لکھا جنہوں نے حسرت کی مثنوی پر، وحشت کو مکمل کیا تھا۔ اپنے نظریات کی وضاحت کے لیے "ادب کی بنیادی قدریں اور موجودہ رجحان"، "تخلیق و تحریک" اور احتشام حسین کے تنقیدی نظریات کے موضوعات پر مقالے لکھے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے نظریات کی انطباقی قدر و قیمت ان تحریروں سے واضح ہوتی ہے جو آپ نے احتشام حسین اور میر غلام علی عشرت کے علاوہ "غالب، اقبال، جمیل مظہری، اور عروج زیدی کے کلام پر لکھے ہیں، مخالف و موافق سب سے ہی پورا پورا انصاف برتا ہے اور ترقی پسندی اور جدیدیت پر بھی معتدل انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔

اس کتاب میں چند اہم مسائل پر بھی بحثیں ملتی ہیں۔ "افسانہ کل اور آج" "اردو کے تعلیمی مسائل"، "پہلے اپنے پیکر خاکی میں جان پیدا کرے"، "نثری داستانوں کے تدریسی مسائل" سارے مضامین اپنے اندر جاذبیت رکھتے ہیں اور ان کو پڑھتے ہوئے ایک تازہ تر نقطۂ نظر ہاتھ آتا ہے۔ مختصر یہ کہ ہمارا فنِ تنقید ڈاکٹر احمد سجاد احمد سے مستقبل کی بڑی امیدیں وابستہ کر سکتا ہے۔

افسوس کہ ہم اس کتاب کے ساتھ ان اوراق میں پورا پورا انصاف نہیں کر سکتے۔ انشاء اللہ تعالیٰ کسی دوسری جگہ تفصیلی گفتگو ہوگی۔

کتاب: سیرت ابوترابؓ
مؤلف: ابن عبدالشکور
ناشر: بنگلور بک ہاؤس، بنگلور (انڈیا)
کاغذ طباعت عمدہ، ضخامت ۸۰ صفحات
قیمت: درج نہیں۔

حضرت سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی سیرت کی جھلکیاں بڑے مؤثر انداز میں پیش کی گئی ہیں۔ اس مختصر کتاب کو پڑھ کر بآسانی خلیفۂ رابع کا رتبۂ عالی سمجھا جا سکتا ہے۔ مؤلف نے ایسی خوبصورتی سے شانِ مرتضویؓ کو بیان کیا ہے کہ کسی اور صاحب مقام ہستی کی ذرہ بھر تنقیص نہیں ہوتی۔ دعائے ابراہیم و خلیل (علیہما السلام) کی قبولیت کا مظہر جس طرح حضور پرنور کی بعثت ہے، اسی طرح "اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ" کا ظہور بھی ثمرۂ دعا ہے۔ پیغمبر آخر الزماںؐ اور اُس کی تیار کردہ امت وسط کے مجموعی تاریخی نقشے میں سیدنا علی مرتضیٰ کا مقام دکھایا گیا ہے۔ اس صحت مندانہ سوانح نگاری کی وجہ سے نہ تو حضرت علیؓ کی شخصیت کوئی عجوبہ بنی، اور نہ وہ حیاتِ ملت کے شجرۂ طیبہ سے منقطع کوئی شاخ۔ مؤلف نے تمام اصحاب رسولؐ کو ایک خاندان اور ایک کارواں کی طرح دکھایا ہے جس کی سربراہی اوّلاً نبیؐ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کرتے ہیں۔

پھر خلیفۂ اوّل، پھر دوم، پھر سوم، پھر چہارم، یہ ایک تسلسلِ عمل مشترک ہے۔ مؤلف نے کسی نقطۂ نظر کے لوگوں کی تنقیص و تعریض سے دامنِ قلم کو بچایا بھی ہے اور جو گرد حضرت علیؓ کی شخصیت کے گرد غلوِ محبت یا خارجیت کی وجہ سے پھیلی ہوئی تھی، اُسے چھانٹ بھی دیا ہے۔ اس طرزِ سوانح نگاری سے شخصیتوں کی روشنی میں نگاہیں خود اسلام کے جمال کی طرف ہوتی ہیں۔

محض ایک نظر

غمِ اعلیٰ | یہ گوہر ملسیانی صاحب کا مرتب کردہ مجموعۂ اشعار ہے۔ اس میں مختلف شعراء کی وہ نظمیں جمع کی گئی ہیں جو سید مودودی مغفور کی رحلت پر لکھی گئی تھیں۔ ۱۲۸ صفحات کا یہ مجموعہ دس روپے میں ملتا ہے۔ یہ گوہر ادب پبلی کیشنز (مظہر فرید کالونی) صادق آباد کا شائع کردہ ہے۔

وہ سورج بن کر اُبھرے گا | یہ راقم الحروف کی ان نظموں کا مجموعہ ہے جو سید مودودی مغفور کی وفات کے بعد متواتر لکھی جاتی رہیں۔ ان کے ساتھ وہ چند نظمیں بھی شامل کر دی گئی ہیں جو مولانا مغفور کی زندگی میں اُن کے متعلق لکھی گئی تھیں۔ یہ مجموعہ البدر پبلی کیشنز لاہور کا شائع کردہ ہے، اور -/۱۵ روپے میں مل سکتا ہے۔

المنذیر | یہ عربی زبان میں مجاہدینِ سوریہ کا ترجمان ہے۔ نصیری حکومت، سُنی اکثریت خصوصاً اخوان المسلمون پر جو مظالم ڈھا رہی ہے، اُن کی تفصیل اس میں پیش کی جاتی ہے، اور حکومت کی پالیسیوں اور اقدامات کا بھی جائزہ لیا جاتا ہے۔ ملنے کا پتہ مذکور نہیں۔ شاید بربنائے احتیاط مقامِ اشاعت کو مخفی رکھا گیا ہے۔ دو چار پرچے ہم تک آئے ہیں۔ کوئی صاحب چاہیں تو حاصل کر سکتے ہیں۔

ضروری اعلان

ہم نے ماہ اگست ۱۹۷۷ء میں رسالہ ترجمان القرآن کے عام پرچہ کی قیمت ۱/۲۵ روپے کی بجائے -/۲ روپے اور سالانہ چندہ -/۱۲ روپے کی بجائے -/۲۰ روپے مقرر کیا تھا۔

اگست ۱۹۷۷ء سے اکتوبر ۱۹۸۰ء تک مہنگائی میں جس قدر اضافہ ہوا، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ان حالات میں رسالہ کی قیمت میں اضافہ ازبس ضروری ہوگیا ہے۔

لہٰذا اب ماہ دسمبر ۱۹۸۰ء سے عام پرچہ کی قیمت -/۲ روپے کی بجائے -/۳ روپے اور سالانہ چندہ -/۲۰ روپے کی بجائے -/۳۰ روپے ہوگا۔

ہمیں قوی امید ہے کہ اس مجبوری کے پیش نظر آپ ہم سے تعاون فرمائیں گے۔

منجانب

ناظم ادارہ ترجمان القرآن

۵-اے ذیلدار پارک اچھرہ۔ لاہور

ادارہ ترجمان القرآن کی نئی پیشکش

جناب محمد صلاح الدین صاحب مدیر "جسارت"

کے قلم سے

بنیادی حقوق

پیش لفظ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

حرفِ آغاز

محمد صلاح الدین

○

کاغذ ولائتی — طباعت آفسٹ — کور خوبصورت

سائز $\frac{18 \times 22}{8}$

○

قیمت: بیس ۲۰ روپے

○

ادارہ ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور